ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

فروری سنہ ۱۹۹۳ء

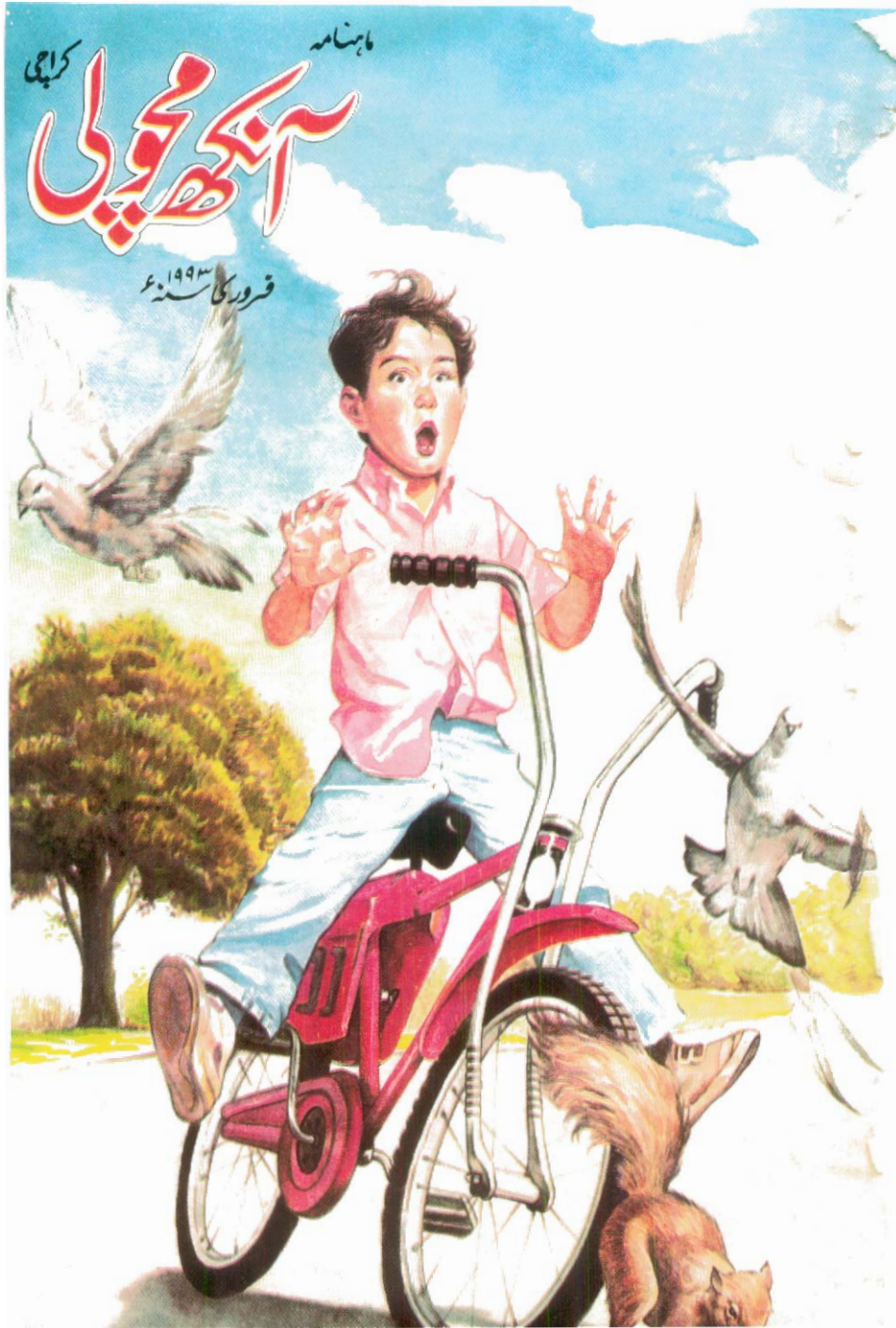

مقدار میں سب سے زیادہ
معیار میں سب سے اعلیٰ

قیمت صِرف
۳۰ روپے

crystal

سہولت سارے گھر کی
بچت مہینہ بھر کی

کوپن ۲۸ فروری ۹۳ء تک بھیج دیجیے

ایسے تحفے اور کس رسالے نے پیش کیے ؟

یہ سوچنا آپ کا کام ہے

ہماری دلچسپی تو **تحفے** پیش کرنے میں ہے۔

آنکھ مچولی
کا ایک اور انوکھا
تحفہ

جیولری بکس
100

بُندے، چوڑیاں، نیکلس اور زیورات محفوظ رکھنے کے لیے

یہ صحیح ہے کہ یہ تحفہ
آنکھ مچولی پڑھنے والی بچیوں کے کام کا ہے

لیکن بچے بھی اسے حاصل کر سکتے ہیں
اپنی بہنوں کے لیے، والدہ کے لیے، رشتہ داروں کو تحفے میں دینے کے لیے

تحفہ حاصل کرنے کے لیے کوپن پُر کر کے بھیجئے

سَو سے زائد کوپن آنے پر فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا

کوپن برائے تحفہ

نام ________ ولدیت ________
کلاس ________ اسکول کا نام ________
پتا ________

کوپن بھیجنے کا پتا: ماہنامہ آنکھ مچولی - ۱ - پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

ڈش انٹینا لگوائیے

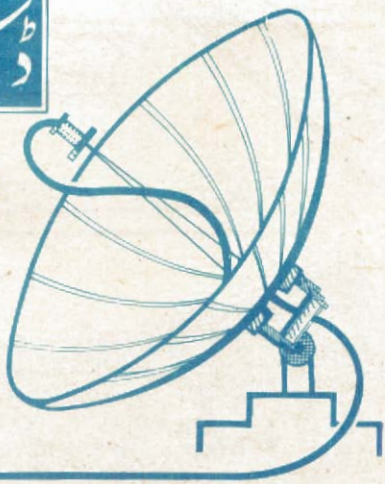

دُنیا
آپ کے ٹی وی سیٹ
میں سمٹ آئے گی

یُوسف الیکٹرانکس

ہمارے ہاں

اسٹیبلائزر، ٹی وی انٹینا، فیڈر وائر، کلر انٹینا، ہر قسم کے اِن ڈور اور ڈش انٹینا
مُناسب قیمت پر دستیاب ہیں

سروس کا اعلیٰ معیار | خدمت کے لیے ہر وقت تیار

یُوسف الیکٹرانکس رحمان مینشن، شاہراہِ لیاقت صدر کراچی ۷۴۴۰۰
فون — ۷۷۳۴۱۰۰

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۸

شعبان / رمضان ۱۴۱۳ھ جنوری / فروری ۱۹۹۳ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مدیرِ اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسئول

ایم اے فاروقی

مشاورت

مشفق خواجہ   امجد اسلام امجد

مدیرِ اعزازی

طاہر مسعود

مجلسِ ادارت

منیر احمد راشد ، محمد عمر احمد خان

نمائندہ امریکہ

عبد الرشید خان

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمّہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میمو ریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی ، گرین گائیڈ اکیڈمی ، ۱-پی آئی بی کالونی ، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۱۱۵۸۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

قیمت ۱۰ روپے

۷ درہم ۷ ریال

آدابِ سفر

اپنے عزیزوں کو لینے یا رخصت کرنے
جب بھی آپ ریلوے سٹیشن آئیں تو
پلیٹ فارم ٹکٹ لینا نہ بھولیں ہو سکتا
ہے کہ بعد میں آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا
پڑے

ایک قابل اعتماد نام پاکستان ریلوے

محکمہ تعلقات عامہ

حُسنِ ترتیب سے

تاریخ کے دریچے سے ــــــ ادارہ ــ ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ــــــ اداریہ ــ ۹
حمد (نظم) ــــــ مراد علی ہاشمی ــ ۱۰
نورِ ہدایت ــــــ م، الف اشد ــ ۱۲
مجھے چاند لے دو ــــــ وسیم بن اشرف ــ ۱۵
ایک کہانی ــــــ عبیداللہ اظہر ــ ۱۸
گھاس کے جانور ــــــ عاصم سفیر ــ ۲۰
لذّت کا راز (نظم) ــــــ محمد خالد ــ ۲۳
بچّوں کا شاعر ــــــ سیّد نظر زیدی ــ ۲۴
آنکھ مچولی جادوگر ــــــ ۲۹
پھر کیا ہوا؟ ــــــ بن یامین ــ ۳۰
مولی کھایئے صحت بنایئے ــــــ نثار احمد ہاشمی ــ ۳۴
ایک ننھی مینڈکی (نظم) ــــــ عبدالقادر ــ ۳۹
بوجھو تو جانیں ــــــ ادارہ ــ ۴۰
بچاؤ ــــــ اشتیاق احمد ــ ۴۴
انوکھا تجربہ ــــــ محمد عادل منہاج ــ ۵۰
گُدگُدے ــــــ لطائف ــ ۵۵
کوئی بتادے کوئی بتادے (نظم) ــ فہیم الحق قریشی ــ ۵۹
ایجادات نمبر ایک قومی خدمت ــــــ ادارہ ــ ۶۰
سونا بنانے کا گُر ــــــ عابد سلطان ــ ۶۴
جب ہاتھ بولنے لگے ــــــ سلمان غزالی ــ ۶۷
جو دے اس کا ہی بھلا ــــــ سیما صدیقی ــ ۷۱
چابی ــــــ نعیم مشتاق نومی ــ ۷۸
امتحان ہے آپ کی ذہانت کا ــــــ ادارہ ــ ۸۰
چیزوں کی کہانی ــــــ آصف فرخی ــ ۸۴
میاں مُرغے (نظم) ــــــ حفیظ الرحمٰن احسن ــ ۸۶
ڈرپوک کہیں کے ــــــ راحت صلاح الدین ــ ۸۷
اللہ بچائے ایسی پکنک سے ــــــ سیّد فضیل علی کاظمی ــ ۹۲
بخدمت جناب ــــــ خطوں کے جواب ــ ۹۸
تعلیم اور کھیل (نظم) ــــــ عامر ظفر شیخ ــ ۱۰۲
آپ بہت اچھے ہیں ــــــ محمد عمر احمد خان ــ ۱۰۳
میں ایماندار بنوں گا ــــــ شگفتہ شمیم ــ ۱۰۸
بٹوارہ ــــــ نجمہ خان ــ ۱۱۵
قلم قلتے ــــــ ننھی تحریریں ــ ۱۱۹
ساتھی بچپن کے ــــــ تعارف ــ ۱۳۴

تاریخ کے دریچے سے

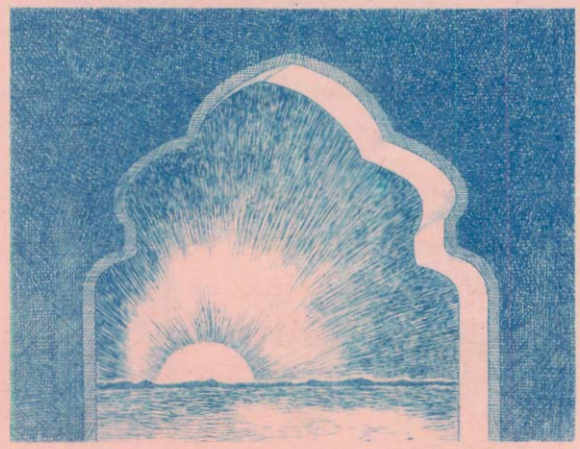

سندھ کا ایک حکمراں جام خیرالدین ایک روز ایک گڑھے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس نے انسان کی ہڈیاں اس میں پڑی دیکھیں۔ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور رُک کر اپنے ساتھیوں سے کہا:

"سنتے ہو یہ ہڈیاں کیا کہہ رہی ہیں۔"

کسی نے جواب نہ دیا۔ جام نے خود ہی کہا: "یہ ہڈیاں کسی مقتول کی ہیں اور انصاف انصاف پکار رہی ہیں۔"

جام خیرالدین نے فوراً تفتیش شروع کر دی۔ وہ زمین ایک بوڑھے شخص کی ملکیت تھی، اسے بلایا گیا اور دیر تک پوچھ گچھ کی گئی۔ بوڑھے نے بتا دیا کہ سات سال قبل گجرات سے آیا ہوا ایک قافلہ یہاں سے گزرا تھا۔ فلاں قبیلے کے آدمیوں نے اس قافلے پر حملہ کر کے اس کے مسافروں کو مار ڈالا تھا اور ان کا سامان لوٹ لیا تھا۔ لوٹ کا کچھ مال اب تک فلاں فلاں کے قبضے میں ہے۔ جام نے لوٹا ہوا مال برآمد کیا۔ مجرموں کو سزائیں دیں اور برآمد شدہ مال گجرات کے حاکم کو بھجوا دیا اور اسے لکھا کہ وہ یہ مال مقتولوں کے ورثا میں بانٹ دیں۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

کسی محفل میں گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ عقل مند آدمی کسے کہیں گے۔ سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ کسی نے کہا عقل مند وہ ہے جو اپنے نفع نقصان پر نظر رکھے۔ کسی نے رائے دی عقل مند اپنے دوست اور دشمن سے واقف ہوتا ہے۔ کسی کا خیال تھا عقل مند ہمیشہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس محفل میں ایک جہاندیدہ بزرگ بھی تھے۔ انھوں نے فرمایا۔ "آپ سب کا کہنا بجا ہے لیکن میرے خیال میں عقل مند وہ ہے جس کی زبان اور دل اس کے قابو میں ہو"۔

بزرگ کی اس بات سے سبھی متفق ہو گئے۔ حالانکہ بات سادہ سی تھی لیکن غور کیجئے تو کتنی مشکل بات ہے۔ آدمی لاکھ چاہے مگر زبان اور دل کبھی نہ کبھی بے قابو ہو ہی جاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آج دنیا میں جتنے جھگڑے اور فساد نظر آتے ہیں ان میں سے اکثر اسی کا نتیجہ ہیں کہ آدمی کو اپنے جذبات پہ قابو نہ رہا اور اس نے طیش میں آکر اول فول بک دیا۔ تمام رنجشیں، کدورتیں اور نفرتیں زبان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لئے بزرگ کہا کرتے ہیں "پہلے تولو پھر بولو"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے سے پہلے سوچ لو۔ بغیر سوچے سمجھے بولنے کا نتیجہ اکثر خراب نکلتا ہے۔

زبان کے ساتھ ساتھ دل کو صاف رکھنا بھی ضروری ہے۔ آپ نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہوں گے جو فوراً دوسروں کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ معمولی معمولی باتیں جن سے دل پہ بوجھ بن جاتی ہیں۔ اور جو اپنی نفرت کو اپنے دل میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کے لئے نہیں، خود اپنے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ ان کا دل بیمار رہتا ہے اور اندر ہی اندر کڑھنے سے خود ان کا خون جلتا ہے۔ بدگمانی اور بدظنی دل کو پراگندہ رکھتی ہے۔ اس لئے اس مرض سے بچنا چاہئے۔

دنیا میں ہم دوسروں کو اپنے کردار ہی سے متاثر کر سکتے ہیں اور ایک اچھے کردار کی پہلی پہچان اچھی زبان اور اچھا دل ہے۔!

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

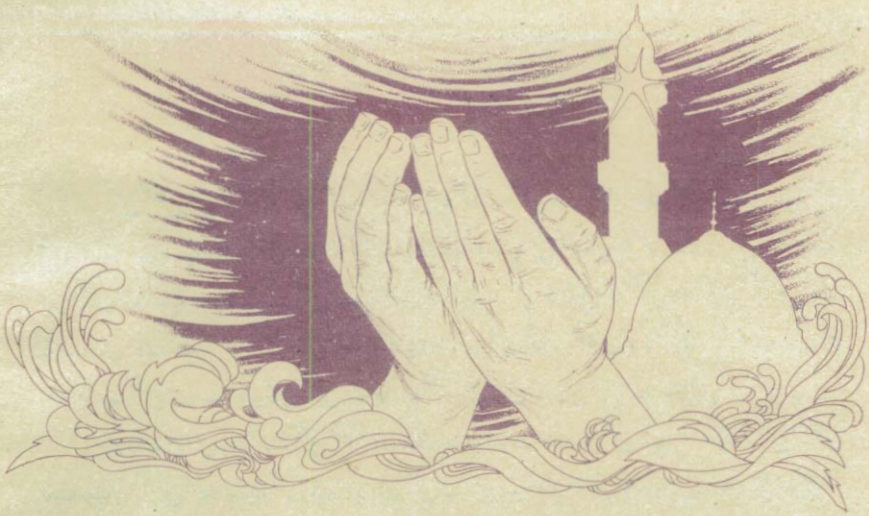

حمدِ باری تعالیٰ

مراد علی ہاشمی

نہ تھے چاند تارے نہ یہ آسماں
فقط تیری ہستی تھی اے لا مکاں

کمالات کا اپنے شاہد ہے تو
ہمیشہ رہے گا وہ واحد ہے تو

کیے تو نے پیدا زمیں آسماں
تری "کُن" سے چشمے ہوئے ہیں رواں

یہ کہسار و حیواں، شجر اور حجر
تری حمد کرتے ہیں شام و سحر

ہے رحمت کا چاروں طرف سائباں
میں کیسے کروں تیری عظمت بیاں

دُعائیں تو سنتا ہے سب کی خدا
نہیں دور رہ کر بھی ہم سے جُدا

ہر اک سمت ہے تیری جلوہ گری
ٹپکتی ہے ہر شے سے کاری گری

کہوں کس طرح تیری کیا بات ہے
ہر اک شے سے اعلیٰ تری ذات ہے

ہے در پر ترے دست بستہ مرادؔ
رہے میرے مولا وہ آباد و شاد

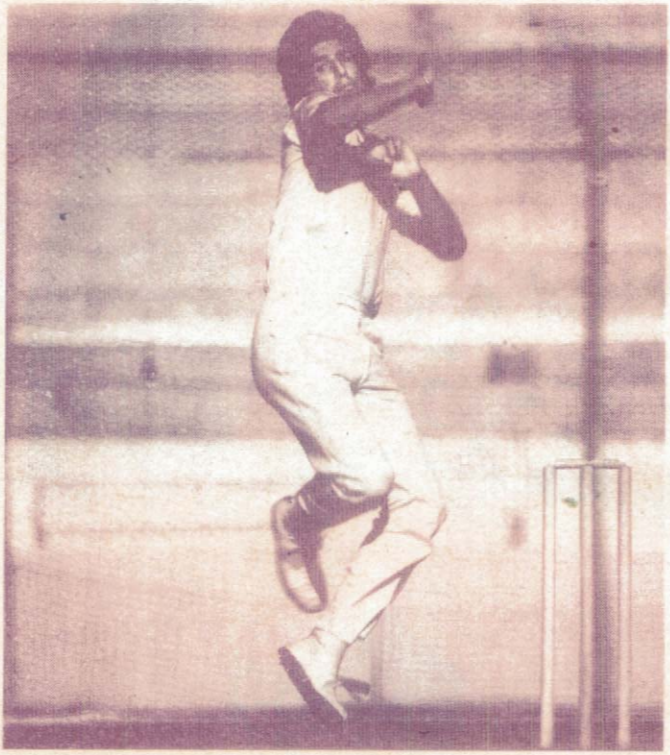

مہارت کی بلندی ۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔ ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں، جہاں وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ ۔ لاجواب پرواز

PID ISLAMABAD

IAL-PIA-32-89

کتاب : "پیغمبرؐ انقلاب"
مصنّف : مولانا عبدالوحید خان

نورِ ہدایت

تلخیص و انتخاب: م۔الف راشد

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو عرب میں پیدا ہوئے اور ۸ جون ۶۳۲ء کو آپؐ کا وصال ہوا۔ آپؐ نہائت تندرست اور طاقت ور تھے۔ بچپن سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا آپؐ کی صحت اور خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر نہ رہتا۔ بڑے ہوئے تو آپؐ کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آپ کو دیکھنے والے آپ سے مرعوب ہو جاتے۔ اسی کے ساتھ اتنے نرم اور شیریں زبان تھے کہ تھوڑی دیر بھی جو شخص آپؐ کے قریب رہتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔ برداشت، سچائی، معاملہ فہمی، حسنِ سلوک آپؐ کے اندر کامل درجے میں پایا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ

آپ ؐ اس انسانی بلندی کی اعلیٰ ترین مثال تھے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (Bala-need Personality) کہا جاتا ہے۔ داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد ؐ بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ ؐ اپنی قوم میں سب سے زیادہ بااخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی اور بد زبانی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ؐ کی قوم نے آپ ؐ کا نام "الامین" رکھا تھا۔ ۲۵ سال کی عمر میں جب آپ ؐ نے شادی کی تو اس موقع پر آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے بھتیجے محمد ؐ بن عبداللہ کا مقابلہ جس شخص سے بھی کیا جائے، وہ شرافت، پاکیزگی، بزرگی اور عقل میں اس سے بڑھ جائے گا۔ خدا کی قسم اس کا مستقبل عظیم ہوگا۔ اور اس کا رتبہ بلند ہوگا۔"

حضرت ابو طالب نے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں کہے تھے جن معنوں میں بعد کو تاریخ نے اسے سچا ثابت کیا۔ انہوں نے یہ بات تمام تر دنیوی معنوں میں کہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص فطرت سے وہ پرکشش شخصیت لے کر پیدا ہوا ہو جو محمد ؐ بن عبداللہ میں نظر آتی ہے وہ بہرحال قوم کے اندر معزز مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور دنیا کے بازار میں اس کی بڑی قیمت مل کر رہتی ہے۔ ایسے شخص کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کی ترقی اور کامیابی کی یقینی ضمانت ہیں۔

آپ ؐ کی زندگی کا مکمل خاکہ آپ ؐ کی اس حدیث سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں آپ ؐ نے فرمایا۔

"میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا۔ کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ سے ڈرتا رہوں۔ غصہ میں ہوں یا خوشی میں ہمیشہ انصاف کی بات کہوں۔ محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں اعتدال پر قائم رہوں۔ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں۔ جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں۔ جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ اور میری خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو۔ میرا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو۔ میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

آپ ؐ کی زندگی اگرچہ نبوت ملنے سے پہلے بھی اس قسم کی تھی مگر وہ تمام تر فطرت کے زور پر تھی۔ اب سچائی کی دریافت نے اس کو شعور کا درجہ دے دیا۔ جو کردار اب تک طبعی تقاضے کے تحت ظاہر ہوتا تھا اب وہ ایک سوچے سمجھے ذہن کا ارادی جزو بن گیا۔ آپ ؐ نے فرمایا۔

"عقلمند شخص کے لئے لازم ہے کہ اس پر کچھ لمحے گزریں۔ ایسا لمحہ جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے۔ ایسا لمحہ جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے۔ ایسا لمحہ جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کر رہا ہو اور ایسا لمحہ جب کہ کھانے پینے کی ضرورتوں

کے لئے وقت نکالے۔

گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے کہ جس کے دن رات کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا کے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ کبھی یوم حساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح ظاہر ہو کہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے۔ کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو جائے کہ اس کے اندر اس کو خالق کے جلوے نظر آنے لگیں اور ضرورت کے مطابق وہ اپنا وقت کھانے پینے کے لئے بھی فارغ کر لیا کرے۔

قیامت میں جواب دہی کا احساس آپ پر ہر وقت طاری رہتا تھا۔ ایک بار آپؐ نے کسی کام سے اپنی خادمہ کو بلایا۔ اس نے اپنے کھیل میں مگن ہونے کی وجہ سے آنے میں دیر کر دی۔ آپ کو بہت غصہ آیا اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ آپؐ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، "اگر قیامت کے دن مجھے بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔"

بدر کی جنگ (رمضان ۲ھ) کے بعد جو لوگ قیدی بن کر آئے وہ آپؐ کے بدترین دشمن تھے۔ مگر آپؐ نے ان کے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ ان قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو آتش بیان خطیب تھا اور تمام مجمعوں میں آپؐ کے خلاف بے ہودہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائے دی کہ اس کے نیچے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا تقریر کا جوش ختم ہو جائے۔ آپؐ نے یہ سُن کر فرمایا۔

"خدا میرا چہرہ قیامت میں بگاڑ دے گا اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ مندرجہ بالا چند واقعات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہمیں بھی اپنے دوستوں، رشتہ داروں، ہم مکتبوں، پڑوسیوں، چھوٹوں حتیٰ کہ دشمنوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہئے۔ باہمی محبت اور احترامِ انسانیت ہی وہ واحد شے ہے جس سے دُکھوں اور تکالیف کی اس دنیا کو سکھ اور راحتوں کی جنت میں بدلا جاسکتا ہے۔

احادیث نبوی

۱۔ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لئے یقیناً دوزخ کی آگ ہے۔

۲۔ روزہ دوزخ کے لئے ڈھال ہے۔

۳۔ جس شخص نے کسی بے گناہ کو قتل کیا گویا اس نے تمام مخلوق کو قتل کیا۔

۳۔ مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے اور نہ لعنت بھیجتا ہے اور نہ بدزبانی کرتا ہے۔

۴۔ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

مرسلہ ..... عامر ممتاز، ڈسکہ

مجھے چاند لے دو

وسیم بن اشرف

اونچے فلیٹوں اور آنگن سے محروم گھروں کے بچوں کے لئے ایک کہانی

مونا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم نیچے میز پر پڑے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا اور نظریں اوپر کمرے کا طواف کر رہی تھیں۔ شاید وہ مسلسل پڑھنے کی وجہ سے اُکتا گئی تھی اس لئے نظریں کتاب پر نہیں تھیں اور قلم، کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح، بے معنی سا اِدھر سے اُدھر چل رہا تھا۔

اچانک وہ چونک اٹھی، گردن تن گئی اور نگاہیں روشن دان سے ہوتی ہوئیں دور بہت دور امبر پر جا ٹھہریں، وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی، وہ چند ثانیے اسی حالت میں رہی۔ پھر سحر زدہ سی اٹھی اور اسٹڈی روم سے باہر آگئی۔ دھیرے دھیرے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی ہوئی اوپر چھت پر چلی آئی۔

"اوہ کتنا پیارا زرد زرد سا چاند ہے۔" اس کے منہ سے سحر زدہ سے انداز میں نکلا۔ مونا نے اس سے قبل ایسا خوبصورت چاند کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مغرب سے کچھ اوپر کا وقت ہو چلا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ بہت سے ستارے اپنی ٹمٹماتی روشنیوں سے آسمان کو منور کر رہے تھے، مگر ان سب کے درمیان ایک خوبصورت شہزادہ مسکرا رہا تھا۔ یہ چاند تھا، جسے ہم سب بچپن میں چندا ماموں کے نام سے پکارتے ہیں۔ مونا ابھی تک متحیر سی وہاں کھڑی تھی۔

"مونا! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ آؤ نیچے چلتے ہیں۔" بڑا بھائی شہریار بھی اوپر ہی چلا آیا لیکن مونا بدستور ٹکٹکی باندھ کر چاند کو تکے جا رہی تھی۔

"آہ! مجھے یہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"بیوقوف لڑکی! تم چاند کو حاصل نہیں کر سکتی ہو۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیسے نہیں؟" مونا نے پوچھا۔

شہریار یہ سن کر بغلیں جھانکنے لگا، اس کے پاس مونا کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

مونا کو معلوم نہ تھا کہ چاند اس کی زمین سے لاکھوں میل دور ہے۔ مونا کی عمر آٹھ سال تھی اور وہ تیسری جماعت کی طالبہ تھی، جبکہ شہریار بارہ برس کا تھا اور چھٹی میں پڑھ رہا تھا۔ شہریار نے مونا کو ہاتھ سے پکڑا اور نیچے لے آیا۔

"چاند کے متعلق کبھی بھی مت سوچنا۔" وہ بولا۔ مونا کوئی جواب دیئے بغیر سیڑھیاں اترنے لگی لیکن وہ اس وقت بھی خوبصورت سی گول گیند کو آسمان پر دیکھ رہی تھی۔ اگلے روز دونوں کی اسکول سے چھٹی تھی، چنانچہ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد شہریار نے اپنی ممی سے اجازت لی اور مونا کی انگلی تھام کر گھر سے باہر بڑی سڑک پر آ گیا۔ ان کا مڈبھیڑ کرنے کا تھا۔ سڑک کے ایک جانب ایک پھیری والا غبارے بیچ رہا تھا۔ اس نے سائیکل کے ہینڈل کے ساتھ بائیں جانب ایک تھیلا لٹکایا ہوا تھا جس میں غباروں کے پیکٹ تھے اور سائیکل کے پیچھے کیریئر پر ایک سبز رنگ کا گیس سلنڈر فٹ کیا ہوا تھا۔ وہ سلنڈر پر لگا ہوا ایک مخصوص لیور دبا کر غباروں میں گیس بھر رہا تھا اور غباروں کو دھاگے کے ساتھ سلنڈر کی اوپر کی جانب باندھتا جا رہا تھا۔ مونا نے پہلے تو اس پھیری والے کو دیکھا پھر چلائی،

"اوہ دیکھو، چاند!"

غبارے والے کے رنگ برنگے غباروں میں ایک خوبصورت زرد رنگ کا غبارہ بھی لٹکا ہوا تھا! غبارے پر چاند بنا ہوا تھا۔

"براہِ مہربانی! میں یہ چاند خریدنا چاہتی ہوں۔" مونا نے پھیری والے سے کہا اور ایک روپیہ نکال کر اسے تھما دیا۔

پھیری والا مسکرایا، روپیہ کو ایک نظر دیکھا۔ پھر زرد غبارہ اتار کر مونا کو تھما دیا۔

"مونا کتنی خوش تھی اپنی پسندیدہ چیز کو پانے

کے بعد! وہ اسے غبارہ نہیں بلکہ چاند سمجھی تھی۔

اگلے روز مونا غبارے کو لے کر باغ میں آگئی اور اسے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کے ساتھ باندھ دیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ اڑ سکتا ہے تو اڑ جائے۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، ادھر شاخ سے کچا دھاگہ ٹوٹا ادھر معصوم بچی کا دل ٹوٹا! غبارہ آزاد ہو کر اوپر ہی اوپر آسمان کی طرف محوِ پرواز تھا۔ مونا اور شہریار دونوں، دور کارخانوں کی چمنیوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے غبارے کو دیکھ رہے تھے۔

"مونا! مت چلاؤ!" شہریار نے کہا

لیکن جیسے ہی کچھ وقت گزرا، وہ بہت زیادہ اُداس ہو گئی۔ اپنی پسندیدہ چیز کو پانے کے بعد اس نے اسے کھو دیا تھا۔

جونہی شام ہوئی، وہ کھڑکی کے پردوں سے آسمان کی طرف جھانکنے لگی۔ اس نے ایک چمکدار چاند دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اس کی چمک دمک دیکھ کر لُطف اندوز ہونے لگی!

"دیکھو! میرے چاند نے اپنے گھر کا راستہ پالیا ہے" وہ چلّائی "وہ بہت خوش دکھائی دے رہا ہے۔ اوہ! دیکھو! کیسے مسکرا رہا ہے! مجھے یقین ہے وہ خود کو وہاں بہت خوش محسوس کر رہا ہو گا۔" پھر اسی طرح چند شامیں اور گزر گئیں۔ مونا نے ایک بار پھر چاند کو دیکھا لیکن اب وہاں دیکھنے کیلئے ایک باریک سا ٹکڑا تھا۔

"میرا چاند، چھپنے کی کوشش کر رہا ہے!" وہ چلّائی۔

شہریار خود بخود مسکرا اٹھا اور مونا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"پیاری بہن! چاند ایک بڑی سی گیند کی طرح ہے جو کہ اس زمین کے گرد چکر لگاتا ہے جہاں ہم رہتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی اس پر پڑتی ہے تو یہ بہت زیادہ چمکدار چاند معصوم ہوتا ہے، ایسے جیسے ایک بہت بڑا آئینہ ہو۔"

"تو کیا میں چاند کو کبھی حاصل نہیں کر سکتی؟" مونا نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"ہاں کبھی نہیں۔"

"مگر کیوں؟"

وہ اس لئے کہ چاند کوئی کھلونا نہیں ہے ہماری زمین جتنا بڑا ہے، اور اتنی بڑی چیز کو حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔"

"آہ!" مونا کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی، جیسے وہ اپنی کسی بہت بڑی خواہش کے کچلے جانے پر افسردہ ہو، پھر وہ چاند کو مخاطب کر کے کہنے لگی "پیارے چاند میں تمہیں پا تو نہیں سکتی، لیکن تمہیں دیکھ تو سکتی ہوں! کبھی بھی میری نظروں سے چھپنا مت! ..... ہاں ..... کبھی بھی نہیں!"

ننھے ننھے آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے۔

ایک کہانی

عبید اللہ اظہر

نظام الملک طوسی تاریخ کے چند معروف زعما میں سے ہیں۔ یہ واقعہ انہی سے متعلق ہے۔ ان کا معمول تھا کہ اپنے ہاں آنے والے علما کی بڑی قدر کرتے۔ ان کو پوری پوری وقعت دیتے اور ان کا احترام ملحوظ رکھتے۔ وہ ہمیشہ چند قدم آگے بڑھ کر علما کا استقبال کرتے۔ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی مسند کے قریب لاتے اور اپنے دائیں بائیں بٹھاتے۔ توجہ اور انہماک سے ان کی باتیں سنتے۔ علما ان کے ہاں سے رخصت ہوتے تو مطمئن ہوتے کہ ان کی عزت افزائی میں کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔ لیکن پھر انہوں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔

علما نے دیکھا کہ ایک عالمِ دین ایسے بھی ہیں جب آتے ہیں تو نظام الملک طوسی ان کا استقبال کرنے کے لئے دروازے تک پہنچ جاتے ہیں، انہیں بڑی محبت سے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اپنی مسند پر بٹھاتے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایسا سلوک تھا جسے سب نے دیکھا اور محسوس کیا۔

اور ایک دن یہ بات زبانوں پر بھی آگئی۔

علما میں سے ایک نے شکایت کے انداز میں نظام الملک طوسی سے کہا..... "علما دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی محفل میں امتیازی سلوک بھی ہوتا ہے"۔

نظام الملک طوسی نے کہا..... "صرف ایک عالمِ دین ایسے ہیں جن کے معاملے میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انکے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے"۔

"جی ہاں لیکن ایک کے ساتھ بھی امتیازی سلوک کیوں کیا جائے؟"

نظام الملک طوسی نے کہا..... "ظاہر ہے اس کی کوئی وجہ ہوگی"۔

سوال کیا گیا.....

"آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

نظام الملک طوسی نے کہا..... "دراصل ان عالمِ دین اور بقیہ علما میں ایک بہت بڑا فرق ہے"۔

نظام الملک طوسی کی یہ بات سن کر تمام علما حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

نظام الملک طوسی نے کہا.....

"آپ حضرات مجھے میرے محاسن سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ میں اسے بھی اہمیت دیتا ہوں لیکن وہ جو آتے ہیں اور جنہیں میں ہمیشہ اپنی مسند پر جگہ دیتا ہوں۔ وہ مجھے میرے عیوب سے آگاہ کرتے ہیں۔"

محفل میں خاموشی چھا گئی۔ پھر نظام الملک طوسی نے سب کو دیکھتے ہوئے کہا.....

"کیا یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اس کی بہت زیادہ قدر کی جائے"؟

●●

پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں
آتے جاتے لوگوں کو

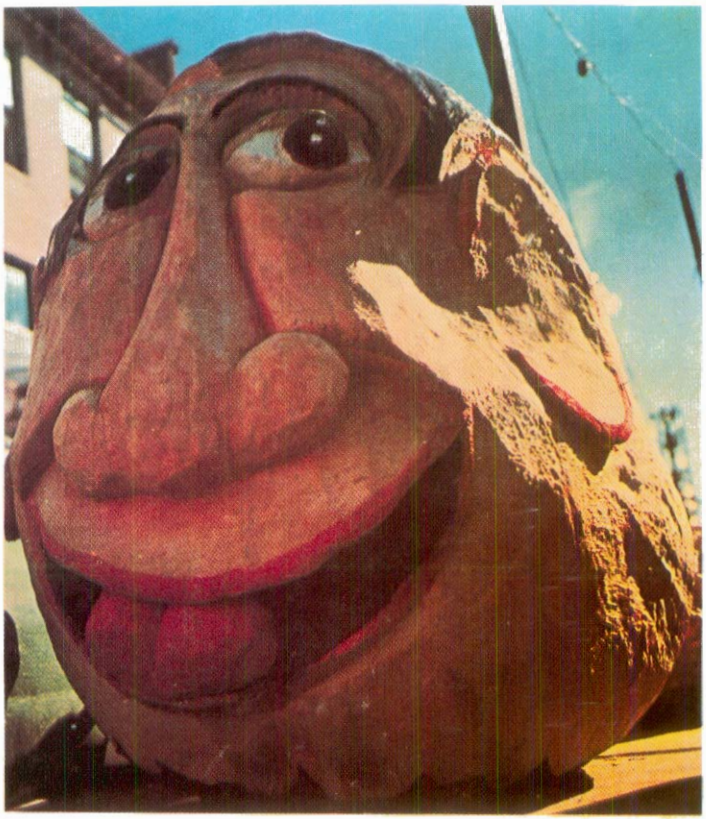

یہ کسی سنگتراش کے فن کا کمال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چہرہ چٹان کے اندر پہلے سے چھپا ہوا تھا۔ سنگتراش نے صرف غیر ضروری پتھروں کو ہٹا دیا اور اندر سے یہ مُسکراتا ہوا چہرہ نکل آیا۔ لیکن اس مُسکراہٹ میں خوشی نہیں ہے، باچھیں کِھلی ہوئی ہیں مگر بے جان ہیں اور آنکھوں میں درد ہے۔ اس دنیا کی حالت پر جہاں بچے بھوک اور بیماری سے مر جاتے ہیں۔ اسکول جانے کے بجائے گیراجوں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے کیا ان آنکھوں میں اُمید کی کوئی کرن بھی ہے؟

خوش و خرم بچے اپنے کھلونوں کے ساتھ

تار سے بنے ہوئے فریم جن پر پودے لگائے جاتے ہیں

فریم پہ پودے لگائے جا رہے ہیں

یہ ہاتھی کیسا ہاتھی ہے؟

گھاس کے جانور

جو گھاس نہیں کھاتے

اگر آپ کو کبھی امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا جانے کا اتفاق ہو اور خوش قسمتی سے آپ سان ڈا یگو نامی چڑیا گھر بھی چلے جائیں تو آپ کو یقیناً ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ہوگا جب آپ دیکھیں گے کہ ایک ہرے رنگ کا خوبصورت سا چیتا ہوا میں معلق ہے۔ ممکن ہے آپ نے ہرے رنگ کا چیتا پہلے کبھی نہ دیکھا ہو ..... لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیتا ایک ہرا بھرا باغ ہے۔ اس کی "کھال" ننھے ننھے پودوں اور پتّوں سے بنی ہوئی ہے۔ اور ایک چیتا ہی کیا، ایسے بے شمار جانور آپ کو اس چڑیا گھر میں مل جائیں گے۔ ہاتھی، خرگوش، کچھوا، مرغ، بلّی وغیرہ۔ یہ سارے جانور دور سے بہت سرسبز اور امن پسند نظر آتے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ان کا بنانا بے حد مشکل کام ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ پتّوں اور پودوں کی مدد سے آپ جو جانور بھی بنانا چاہیں، بنا سکتے ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک آرٹسٹ تاروں سے اس جانور کا پہلے فریم بنا دے، پھر اس فریم کو سبزے سے ڈھانپنا آسان ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پودوں کو پھلنے پھولنے اور ان کی کانٹ چھانٹ میں بہت محنت کرنے اور احتیاط رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان "نباتاتی جانوروں" میں زندگی موجود ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ پودے گرد و پیش کے ماحول اور آوازوں سے متاثر ہوتے ہیں یا انہیں محسوس کر سکتے ہیں تو پھر ان جانوروں کے زندہ ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

حقیقتاً گھاس اور پودوں کے جانوروں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انسانی دماغ کیسی کیسی باتیں سوچ سکتا ہے اور کیسی انوکھی اور چونکا دینے والی چیزیں بنا سکتا ہے۔ مگر یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا ذہن تعمیری انداز میں سوچنے کا عادی ہو۔

ایسے لوگ جو صرف تخریبی ذہن رکھتے ہوں اور توڑ پھوڑ اور چیزوں کو خراب کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے ہوں۔ ان سے ایسے مزیدار اور اچھے کام کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

●●

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ؐ سیرت طیبہؐ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۵۰ روپے	۳۰ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۵ روپے	۱۱ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق السکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	٦ روپے	۴ روپے

آپ صرف ۶۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۔ پی۔ آئی۔ بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۰

لذّت کا راز

محمد خالد

اک شخص نے جا کر کسی انگور سے پوچھا
کس شے نے بنایا ہے تجھے اس طرح میٹھا؟
کس حال میں گزری ہے تری عمر چمن میں
مالی نے شجر تیرا وہاں کس طرح سینچا؟
کہنے لگا انگور مرا راز یہی ہے
فدوی نے کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا
گرمی کی تکالیف بہت میں نے اٹھائیں
یخ بستہ ہواؤں نے مرے جسم کو توڑا
طوفان مرے سر سے گزرتے رہے دن رات
ان سارے مصائب نے لہو میرا نچوڑا
صدماتِ زمانہ سے ہوا اتنا مزے دار
ہے راز یہی جس نے بنایا مجھے میٹھا

بچّوں کے شاعر

مولانا اسمٰعیل میرٹھی

سیّد نظر زیدی

یوں تو بچّوں کے لئے بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں، لیکن جو مقبولیت ور شہرت مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو حاصل ہوئی ابھی تک کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ کسی شاعر کے اس لرح مشہور اور مقبول ہو جانے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے اچھے خیالات کی وجہ سے اللہ پاک سے خاص برکتیں دے دیتا ہے۔ دوسری وجہ اس کے شعروں کی اچھائیاں ہوتی ہیں اور مولانا کو اللہ ک نے اپنی خاص مہربانی سے یہ دونوں خوبیاں دی تھیں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے بچّوں کے لئے جو نظمیں لکھیں ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن وہ ایسی مشہور اور مقبول ہوئیں کہ اُردو کے کسی اور شاعر کو ان کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان سب نظموں میں نیکی اور بھلائی کی باتیں بتائی گئی ہیں اور ان کی زبان ایسی میٹھی اور آسان ہے کہ ہر بات بالکل آسانی سے سمجھ میں آجاتی اور دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

خاندان:

مولانا اسمٰعیل میرٹھی صدیقی شیخوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے بزرگ مجاہدوں کے کسی لشکر میں شامل ہو کر عرب سے نکلے اور ترکی کے شہر خوجند میں آباد ہو گئے۔ اس کے بعد اس خاندان کے کچھ لوگ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے ساتھ ہندوستان آئے اور شہر میرٹھ کے محلے مشائخاں میں آباد ہوئے۔ مغل شہنشاہ جلال الدّین اکبر نے اس خاندان کے بزرگوں کو میرٹھ کے قریب موضع لاوڑ میں جاگیر دی تھی۔ وجہ یہ کہ وہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ بہت اچھے فوجی سپاہی بھی تھے۔ انہیں ایک ہزاری منصب بھی حاصل تھا۔

محلّہ مشائخاں شہر میرٹھ کے محلے اندر کوٹ کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا ایک نام بالائے قلعہ بھی ہے۔ مولانا کے والد صاحب شیخ پیر بخش اسی محلے میں رہتے تھے۔ مولانا ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو یہیں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت:

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی۔ فارسی ایک مشہور عالم مرزا رحیم بیگ سے پڑھی اور علمِ ہندسہ، فزیکل سائنس اور علم ہیئت پڑھنے کے لئے ایک ہندو عالم پنڈت ایسری پرشاد کو استاد بنایا۔

اس سے آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے رڑکی کالج میں داخل لیا۔ اس کالج میں انجینئرنگ اور اس سے متعلق علوم پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا کے بزرگ انہیں اوور سیئر بنانا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ سے اس کالج میں مولانا کا دل نہ لگا۔ وہ میرٹھ آگئے اور جولائی ۱۹۶۰ء میں انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک بھرتی ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ برس تھی۔ اس دفتر میں سات برس رہے۔ ۱۸۶۷ء میں ضلع مڈل اسکول کے مدرّس بن کر سہارنپور آگئے اور پھر پوری زندگی اپنے صوبے کے مختلف اسکولوں میں بچوں کو پڑھاتے رہے۔ زندگی کا زیادہ حصہ آگرہ میں گزارا۔

شاعری کا آغاز:

مولانا کی شاعری کا آغاز ایک عجیب سے واقعے سے ہوا۔ ان کے محلے اندر کوٹ میرٹھ میں محکمۂ تعلیم کے ایک افسر منشی نجم الدین ان کے پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت محلے کے اکثر نوجوان ان کے گھر آجاتے تھے اور رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دوستوں کی اس محفل میں مولانا بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

ایک شام کسی نے یہ تجویز پیش کر دی کہ ہر شخص اُردو زبان کا وہ شعر سنائے جو اسے پسند ہو۔ سب نے اپنی اپنی پسند کے شعر سنا دیئے۔ لیکن مولانا کو کوئی شعر یاد نہ آیا۔ دوستوں سے

اجازت لے کر انہوں نے فارسی زبان کا ایک شعر پڑھ کر جان چھڑائی۔

کوئی اور ہوتا تو شاید اس واقعے کو یاد بھی نہ رکھتا۔ لیکن مولانا نے اپنی اس کمزوری کو بہت محسوس کیا کہ وہ اپنی زبان اُردو کا ایک شعر بھی نہ سنا سکے اور اسی دن سے اُردو کے مشہور شاعروں کے کلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعے کے دوران میں کسی طرح انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ خود بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے شعر لکھنے شروع کر دیئے اور یوں اُردو زبان کو ایک بے مثال شاعر مل گیا۔ خاص بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ محکمۂ تعلیم کے ایک انگریز ڈائریکٹر مسٹر کیمسن نے میرٹھ کے ایک شاعر حضرت قلق میرٹھ سے انگریزی زبان کی کچھ اخلاقی نظموں کا ترجمہ کروایا تھا۔ مولانا نے قلق صاحب کی یہ نظمیں پڑھیں تو ان کے دل میں ایسی ہی نظمیں لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

اس زمانے میں اُردو زبان کے شاعر زیادہ تر غزلیں، قصیدے، مرثیے، یا نعتیں لکھتے تھے۔ ایسی نظمیں لکھنے کا رواج ہی نہ تھا جن میں زندگی کے عام معاملات کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں ایسی نظمیں بہت لکھی جاتی تھیں۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اِرادہ کر لیا کہ آئندہ صرف ایسی ہی نظمیں لکھیں گے اور اپنی اس کوشش میں ایسے کامیاب ہوئے کہ پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ سرسید، مولانا حالی، شبلی نعمانی اور حضرت اکبر الٰہ آبادی وغیرہ ملک کے سب بڑے عالموں اور شاعروں نے ان کی تعریف کی۔

بچوں کے علاوہ مولانا نے بڑوں کے لئے بھی بہت سی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں اور ان سب میں بہت پاکیزہ خیالات نظم کیے ہیں۔ خاص طور سے اللہ کی تعریف میں جو شعر لکھے ہیں وہ تو بہت ہی اچھے ہیں اور تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ ان کے اچھے خیالات اور اعلیٰ درجے کی شاعری کی وجہ سے انہیں ہندوستان کا سعدی کہا جاتا تھا۔

نظموں کے علاوہ مولانا نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں درسی یعنی اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کتابوں سے انہیں بہت آمدنی ہوئی اور انہوں نے اچھی خاصی جائیداد بنائی۔

قومی خدمت:

بہت اونچے درجے کا شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ مولانا اپنی قوم سے محبت کرنے کے معاملے میں بھی بلند مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلمان بچوں کیلئے مدرسہ بنات المسلمین کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ غریب مسلمان طالب علموں کی امداد اور فضول رسموں اور رواجوں کو روکنے کے لئے ایک انجمن بنائی۔ شہر میرٹھ میں مسلم لیگ کا دفتر قائم ہوا تو اس کے نائب صدر

رہے۔ انجمنِ ترقی اُردو کی شوریٰ کے رکن بنائے گئے۔

اخلاق اور عادتوں کے لحاظ سے وہ بہت اونچے درجے کے انسان تھے۔ وہ غیر مسلموں تک کا بھلا چاہتے تھے اور اس بات کے لئے کوشش کرتے رہتے تھے کہ سب مل جل کر پیار محبت سے زندگی گزاریں۔ ایک سال ایسا ہوا کہ محرّم اور ہندوؤں کا تہوار قریب کی تاریخوں میں آگئے۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائیاں ہو جایا کرتی تھیں۔ مولانا نے معزّز مسلمانوں اور ہندوؤں کو بلا کر ایسا سمجھوتہ کرا دیا کہ دونوں قوموں نے اپنے اپنے تہوار امن سے منائے۔

وہ ۱۸۹۹ء میں ریٹائر ہو کر میرٹھ آگئے تھے۔ باقی ساری زندگی لکھنے پڑھنے اور لوگوں کی بھلائی کے کام کرنے میں گزاری۔

وفات:

ان کا انتقال یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا۔ بس چند دن بیمار رہے۔ سر درد اور بخار ہوا اور اس معمولی تکلیف میں مبتلا رہ کر اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی بہت بڑی تعداد نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ اللہ ان سے راضی ہو اور جنت میں انہیں اونچا درجہ عطا کرے۔ (آمین)

رزقِ حلال

سلطان محمود غزنوی ہندوستان آئے تو ان کی فوج میں کسی بیوہ کا جوان بیٹا بھی شامل تھا جو جنگ میں شہید ہو گیا۔ سلطان فتح یاب ہو کر واپس غزنی پہنچے تو وہ بیوہ اپنے بیٹے کی تلاش میں آئی۔

دوسرے سپاہیوں نے بتایا کہ "تمہارا بیٹا میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا ہے۔"

بیوہ نے پوچھا۔

"میرا بیٹا کس طرح شہید ہوا؟"

سپاہیوں نے کہا "دشمن کا تیر اس کی پُشت پر لگا اور وہ شہید ہو گیا۔"

بیوہ نے کہا۔ "میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ تیر میرے بیٹے کی پُشت پر لگا ہو یا اس نے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر سر جھکایا ہو۔ میں نے اس کے حلق میں حرام دودھ کا ایک قطرہ نہیں جانے دیا تھا جس بچے کی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی ہو ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پیٹھ پر تیر کھائے۔"

بات سلطان محمود غزنوی تک پہنچی انہوں نے تحقیق کروائی تو بیوہ کی بات دُرست نکلی اس کے جیالے بیٹے نے سینے پر تیر کھا کر جان دی تھی۔

(ثوبیہ شمیم، کراچی)

اقوالِ زرّیں

۱۔ علم و ادب سے بڑھ کر کوئی میراث نہیں۔

۲۔ معاف کرنا دشمن پر فتح پانے کی زکوٰۃ ہے۔

۳۔ خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔

۴۔ سچی لگن کو کانٹوں کی پروا نہیں ہوتی۔

۵۔ خاموشی سے بندہ باوقار رہتا ہے۔

مرسلہ۔ سہیل احمد خان جدون، کراچی

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — ہر روز مرغا بننا، ہر روز مار کھانا

آنکھ مچولی جادوگر

کسی کے بہن بھائیوں کی تعداد بتانے کا طریقہ

یہ دلچسپ کھیل آنکھ مچولی کے کسی ساتھی نے ارسال کیا ہے۔ وہ اپنا نام اور پتا لکھنا شاید بھول گئے تھے۔ ان سے درخواست ہے کہ اپنا نام اور پتا ارسال کردیں۔ (ادارہ)

آپ اپنے کسی دوست سے کہیں کہ بھائیوں کی تعداد دل میں سوچے۔ اس کے بعد اس تعداد میں ۲ جمع کرائیں۔ پھر مجموعے کو ۲ سے ضرب دلائیں۔ اس کے بعد ۱ جمع کرائیں۔ پھر مجموعے کو ۵ سے ضرب دلائیں۔ اب کہیں کہ اس مجموعے میں بہنوں کی تعداد جمع کرلو۔ پھر مجموعہ پوچھ کر دل میں اس سے ۲۵ نفی کر دیں جو جواب آئے گا۔ اس کا دایاں ہندسہ بہنوں کی اور بایاں ہندسہ بھائیوں کی تعداد ہو گا۔ اگر ایک طرف صفر آجائے تو سمجھ لیں۔ بہن نہیں ہے۔ اور اگر بائیں طرف کچھ نہ بچے تو بھائی نہیں ہے۔

حل۔ مثال کے طور پر بھائیوں کی تعداد	= ۲
۲ جمع کرنے سے	۴ = ۲ + ۲
۲ سے ضرب دینے سے	۸ = ۲ × ۴
۱ جمع کرنے سے	۹ = ۱ + ۸
۵ سے ضرب دینے سے	۴۵ = ۵ × ۹
بہنوں کی تعداد مثال کے طور پر	۳
کل مجموعہ	۴۸ = ۳ + ۴۵
۲۵ نفی کرنے	۲۳ = ۲۵ - ۴۸
بہنوں کی تعداد	= ۳
بھائیوں کی تعداد	= ۲

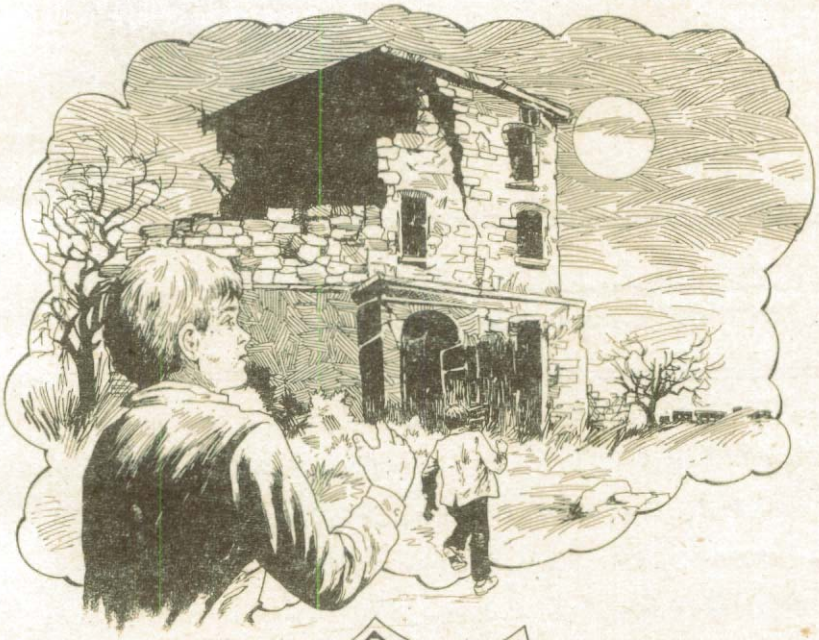

پھر کیا ہوا؟

بنتِ یامین

وہ بنگلہ تو کہیں سے بھی نہیں تھا..... بنگلہ تو کیا وہ ایک مکان کہلائے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور چوکھٹوں کا ایک مجموعہ..... لیکن اپنی پراسراریت کے باعث وہ "بھوت بنگلہ" کہلاتا تھا۔ غالباً اس کو یہ نام پُراسرار کہانیاں پڑھنے والے کچھ لڑکوں نے دیا تھا۔

بہرحال، اب یہ نام زبان زدِعام ہوچکا تھا۔

اس "بھوت بنگلے" کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور تھے۔ کئی منچلے تو یہاں چڑیلیں بھی دیکھ چکے تھے۔ لیکن "عینی شہادت" کے یہ واقعات ہمیشہ انفرادی گواہی کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ یعنی کبھی کسی گروپ نے اجتماعی طور

پر اس کا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ لہٰذا لوگ اس کی صداقت کے متعلق شش و پنج میں رہتے۔ کبھی کوئی پُراسرار واقعہ لے کر آتا تو سوالوں اور ضمنی سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوجاتی۔ مثلاً

"میں نے وہاں خود چڑیل دیکھی تھی۔" کوئی کہتا۔

"کیسی تھی اس کی شکل و صورت؟" کوئی پوچھتا۔

"بہت خوفناک تھی۔ تم ہوتے تو ڈر کے مارے ....."

"کیوں کیوں میں کیوں ڈرتا؟" وہ اس پر اُلٹ پڑتا۔

"چھوڑو چھوڑو..... یہ بتاؤ اس کے پاؤں بھی دیکھے تھے۔" کوئی دوسرا کہتا۔

"ہاں! ہاں!!"

"کیسے تھے اس کے پاؤں؟"

"جیسے ہم لوگوں کے ہوتے ہیں!!!"

"تو بھائی تم نے کچھ اور دیکھ لیا ہوگا۔ چڑیلوں کے پاؤں تو اُلٹے ہوتے ہیں۔" وہ کہتا۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ ان کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں؟"

اصل قصہ ایک طرف رہ جاتا اور چڑیلوں کے پاؤں پر بحث شروع ہوجاتی۔

"یار تمہیں ماچس جلا کے دیکھ لینی چاہئے تھی۔ چڑیل ہوتی تو آگ دیکھ کر غائب ہوجاتی۔" کوئی دوسرا کہتا۔

"یار اب میں ماچس جیب میں ہر وقت تو لے کر گھومنے سے رہا۔" اتنی دیر میں قصّے کے روایت کرنے والے کا مزاج بگڑ چکا ہوتا۔ ایسے کتنے ہی واقعات پیش آئے تھے۔

کبھی کبھی راتوں کو لوگوں کو یہاں پر پُراسرار قسم کی آوازیں سنائی دیتیں۔ چھن چھن اور دھم دھم کی آوازیں لیکن ڈر کے مارے کسی کی اس مکان کے اندر جانے کی تو کُجا، اس کے قریب سے گزرنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔

ثاقب کو ان چڑیلوں وغیرہ کے قصّے پر کبھی یقین نہیں آیا تھا لیکن ان آوازوں کو اس نے خود اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ یہ کسی قسم کا صوتی مغالطہ بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی کہیں دور سے آنے والی آوازیں اس مکان کے خالی ہونے کے باعث اس میں ایکو پیدا کردیتی ہوں۔

ثاقب عمر کے جس حصے میں تھا، اس میں تجسّس کا عنصر اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اس مکان کے بارے میں اس کا تجسّس عین فطری تھا لیکن وہ اپنے گھر والوں کی سختی کے باعث کبھی اس مکان میں نہیں گیا تھا۔

لیکن اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی رات وہ اس مکان میں ضرور داخل ہوگا۔ ثاقب جوش کے ساتھ ہوش سے کام لینے کا عادی تھا، لہٰذا اس نے اس "بھوت بنگلے" میں داخل ہونے سے پہلے

پوری منصوبہ بندی کا سوچا تھا۔

اس کی پلاننگ کے پہلے مرحلے پر اس کو ایک نڈر اور قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بلال پر پڑی۔ ثاقب کے نزدیک وہ خاصا نڈر لڑکا تھا۔ ثاقب نے جب بلال سے اس موضوع پر بات کی تو وہ فوراً راضی ہوگیا بلکہ وہ تو خود کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا، اور ثاقب کی پیشکش سے اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔

دو افراد کی اس ٹیم کی تشکیل کے بعد انہوں نے اس مُہم کو سر کرنے کے لئے ضروری سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ یعنی ٹارچ، رسّی، چاقو وغیرہ۔

تمام سامان ایک بیگ میں جمع کرنے کے بعد انہوں نے کوئی ایک دن مخصوص کرنے کا سوچا۔

"میرا خیال ہے جمعرات کے دن عشا کے بعد کا وقت نہایت موزوں رہے گا۔ اس رات کو ہماری تھوڑی دیر کی غیر حاضری کو کوئی محسوس نہیں کرے گا کیونکہ جمعرات کی رات کو تو ویسے ہی ہم دیر تک بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔" بلال نے کہا۔

"ہاں یہ بات تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ثاقب نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"لیکن جمعرات کی رات تک کا وقت گزارنا انہیں خاصا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔

..... ○○○ .....

بالآخر جمعرات کی رات آگئی۔ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد یہ دونوں سامان لے کر ایسے راستوں سے "بھوت بنگلے" کی طرف روانہ ہوگئے جہاں ان پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

بھوت بنگلے کے باہر پہنچ کر دونوں پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ خوف تھا یا حد سے بڑا ہوا تجسس، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کو اپنے دل کی دھڑکن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔" ثاقب نے سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے ..... ایک وقت میں ایک آدمی کو اندر جانا چاہئے تاکہ ایک مصیبت میں پھنس جائے تو دوسرا مدد لا سکے۔" بلال نے مشورہ دیا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" ثاقب نے کہا۔ "میں اندر جاتا ہوں۔"

"نہیں ثاقب پہلے مجھے اندر جانے دو۔ تمہارے دوڑنے کی رفتار تیز ہے۔ خدانخواستہ کسی پریشانی کی صورت میں تم جلدی مدد لا سکو گے۔" بلال نے کہا۔

بات اس کی معقول تھی لہٰذا ثاقب مان گیا۔

بلال نے آگے بڑھ کر دروازے کو دھکا دیا۔ چررر ..... کی ایک خوفناک آواز پیدا ہوئی۔ بلال کا دل ڈانواڈول ہوگیا لیکن اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا جیسے خوف کو جھٹکنا چاہتا ہو۔

"خدا حافظ ثاقب۔ دس منٹ تک میری طرف سے کوئی جواب نہ آئے تو تم مدد لینے چلے

جانا۔"

یہ کہہ کر بلال اندر چلا گیا۔ باہر ثاقب کے لئے ایک ایک سیکنڈ گزارنا دشوار ہو رہا تھا۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ چھ، سات، آٹھ ..... نو۔ اب یہ دسواں منٹ چل رہا تھا۔

دس منٹ گزر گئے۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ثاقب کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس لمحے کو کوسنے لگا جب وہ بلال کے پاس گیا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ پچھتانے سے کیا ہوگا۔ اب مدد لینے جانا چاہئے۔ لیکن ایک نظر اندر جھانک کر دیکھ تو لینا چاہئے۔

یہ سوچ کر وہ دیوار پر لٹک گیا۔ دیوار سے سر اونچا کر کے اس نے اندر دیکھا تو ایک عجیب و غریب منظر اس کے سامنے تھا۔ اتنا عجیب منظر اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا .....

.....

.....

یہ کہانی یہیں ختم ہوگئی ہے۔ آپ غلط سمجھے، اس کی کوئی اگلی قسط بھی نہیں پیش کی جائے گی۔ کتنی کوفت ہوئی ہے ناں آپ کو یہ اَدھوری کہانی پڑھ کر۔ ایک خلش چھوڑ گئی ہوگی یہ اَدھوری کہانی آپ کے ذہن پر۔ بس سمجھ لیجئے اسی طرح آپ کے کئے ہوئے ادھورے کاموں سے دوسرے لوگ کوفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جو کام بھی اپنے ذمہ لیں اس کو پورا کریں۔ یہی اس اَدھوری کہانی کا پیغام ہے۔ اگر آپ کو ذرّہ برابر بھی احساس ہو گیا ہو تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اس اَدھوری کہانی نے ایک مکمل کہانی سے بڑھ کر کام کیا ہے۔

ننھے شہید

کانپور میں ایک سڑک کے ایک جانب مسجد اور دوسری جانب ایک مندر تھا۔ برطانوی حکومت نے سڑک کشادہ کرنے کے لئے مسجد گرانے کا فیصلہ کیا۔ سنگینوں کے سائے میں بلڈوزروں سے مسجد گرا دی گئی۔

جب فوج چلی گئی تو مسلمان جوان، بوڑھے اور بچے اسی وقت مسجد کی تعمیر نو میں مصروف ہو گئے۔ اطلاع ملنے پر فوج فوراً وہاں پہنچ گئی اور مسلمانوں پر فائرنگ کرنے لگی۔ سب سے پہلے ننھے بچوں نے آگے بڑھ کر گولیوں کی بوچھاڑ اپنے سینوں پر روکی، پھر جوان اور بڑھے آگے بڑھے اور موقع پر ہی شہید ہو گئے۔

علامہ شبلی نعمانی نے ان شہداء کے متعلق پر اثر نظم لکھی اور کیا زندۂ جاوید شعر قلمبند کیا۔

"عجب کیا ہے جو لوٹ خیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں کہ ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے"

مرسلہ ..... نثار احمد ہاشمی

مولی کھائیے صحت بنائیے

نثار احمد ہاشمی

مولی بڑی ہی مشہور سبزی ہے اور دنیا کے بیشتر علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ سردی کی سبزی ہے مگر اب یہ تقریباً ہر موسم میں کراچی جیسے بڑے شہروں میں نظر آتی ہے۔ مولی کے فائدے تو بہت سے ہیں مگر مختصراً چند فائدوں کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔

مولی کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہاضمے کو ٹھیک رکھتی ہے۔ اسے تمام طبیبوں نے ہاضم طعام لکھا ہے مگر اس کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ یہ غذا کے بعد بہت تھوڑی مقدار میں کھائی جائے۔ مولی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ خود دیر ہضم ہے اور جب تک معدے میں رہتی ہے گندی ڈکاروں کا سبب بنتی ہے۔ مولی کو غذا کے ساتھ پکا کر کھانے میں حرج نہیں ہے لیکن اگر اسے کسی بھی غذا کے ساتھ کچا کھایا جائے تو یہ باقی غذا کو بھی دیر ہضم بنا دیتی ہے، چنانچہ ایسی غذا جس کے ساتھ کچی مولی کھائی گئی ہو دیر تک معدے میں پڑی رہتی ہے۔

کھانے کو ہضم کرنے کے لئے مولی سے بہتر

اس کے پتے ہیں۔ ان میں فساد بھی کم ہے اور مولی کی بہ نسبت جلد ہضم ہو جاتے ہیں اور بدبو دار ڈکاروں کا سبب بھی نہیں بنتے، چنانچہ کھانا کھانے کے بعد دو چار پتے پانی سے اچھی طرح دھو کر کھا لینے چاہئیں۔ اس سے کھانا بلا تکلیف ہضم ہو جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کھانے کو ہضم کرنے کے لئے کسی ہاضمے کی دوا، چورن یا گولیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

مولی خون کو پتلا کرتی ہے، ہائی بلڈ پریشر کو کم کرتی ہے، خون کی چربی کو حل کر دیتی ہے۔ دورانِ خون کو بحال رکھنے میں مولی اور اس کے پتوں کا بڑا عمل دخل ہے مگر زیادتی نہ کی جائے۔ کیونکہ بہر حال اس کے نقصانات بھی ہیں جن سے بچنا بھی ضروری ہے۔

مولی الرجی میں بڑی مفید ہے۔ اس کے اس فائدے کا تعلق اس کے اس عمل سے ہے جو یہ گُردوں میں کرتی ہے۔ یہ پیشاب کی جلن کے لئے بہت مفید ہے اور مجموعی طور پر یہ تمام آلات بُول کی دھلائی کرتی ہے۔ مولی بعض اقسام کی پتھریوں کو پگھلا دیتی ہے اور پیشاب کے راستے خارج کر دیتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مولی کے سینکڑوں نسخے بھی کتابوں میں موجود ہیں۔ مولی جگر میں ایسی مفید ہے کہ یرقان کے علاج میں ہمیشہ اس کے پتوں کو شامل رکھا جاتا ہے۔

بے مثال حافظہ

فیضی اور ابوالفضل دو بھائی تھے اور دونوں بہت عالم فاضل تھے۔ ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔ فیضی کا تو یہ حال تھا کہ اگر ایک دفعہ کسی لمبی سے لمبی نظم کو سن لیتا تو وہ اسے زبانی یاد ہو جاتی۔ اور اگر ابوالفضل دو دفعہ سنتا تو اسے بھی حفظ ہو جاتی۔ ان کا ایک نوکر تھا۔ وہ کوئی نظم تین دفعہ سن لیتا تو وہ اس کو یاد ہو جاتی تھی۔

یہ دونوں بھائی شہنشاہ اکبر کے وزیر تھے۔ اکبر کے دربار میں بڑے بڑے شاعر آتے اور اپنا کلام سناتے تاکہ بادشاہ سے انعام و اکرام حاصل کریں۔ لیکن جب شاعر اپنا کلام ختم کرتا تو فیضی کہہ دیتا کہ حضور یہ کلام تو میرا ہے۔ شک ہو تو مجھ سے سن لیجئے اور وہ اس نظم کے تمام اشعار فرفر سنا دیتا۔ اس کے بعد کہتا کہ اگر حضور کو اور ثبوت چاہئے تو ابوالفضل سے سن لیجئے چنانچہ ابوالفضل بھی سنا دیتا۔ پھر کہتا اگر آپ اور تسلی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے نوکر سے سن لیجئے۔ شاعر بے چارے بہت سٹ پٹاتے۔

کہتے ہیں ایک دن ایک شاعر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا اور قصیدہ پڑھنا شروع کیا ابھی ایک بند ہی پڑھا تھا کہ فیضی پکار اٹھا۔ کہ یہ کلام میرا ہے۔ شاعر تھا بڑا ہوشیار۔ اس نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ حضور چرائے ہوئے کلام کی تصدیق اسی وقت ہو سکتی ہے کہ ایک شعر میں پڑھوں اور دوسرا فیضی پڑھ کر سنائے شاعر کی یہ بات سن کر فیضی خاموش ہو گیا۔ اکبر نے شاعر کو انعام دے کر رخصت کیا اور فیضی کی طرف دیکھ کر کہا "آج تم پکڑے گئے۔"

مرسلہ..... محمد ایوب منظر۔ لاہور

"بچے قوم کی امانت ہیں"
"بچے ہمارا مستقبل ہیں"

"بچے یہ ہیں، بچے وہ ہیں" ——— قوم کے رہنماؤں سے آپ نے ایسی بہت سی باتیں سنی ہوں گی ———

لیکن ہمارے ملک میں اور ساری دنیا میں بچوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے..

یہ جاننے کے لئے

حقوق اطفال نمبر

پڑھیے

آنکھ مچولی کی مفید اور معلوماتی دستاویز

اقوام متحدہ کے منظور کردہ بچوں کے حقوق کے عالمی منشور کی روشنی میں

* قیمتی معلوماتی مضامین
* آنکھیں کھول دینے والے فیچر
* سبق آموز مگر دلچسپ کہانیاں
* درد انگیز نظمیں

اپریل ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پہ آ رہا ہے

اور وہ سب کچھ جو صرف آنکھ مچولی میں پڑھنے کو مل سکتا ہے۔

"اطفال نمبر" کے بعد "حقوق اطفال نمبر" بچوں کے ادب میں بے بہا اضافہ ثابت ہوگا

آپ بھی لکھیے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دینا ہماری روایت ہے

BIG DADDY

خالد خلیل

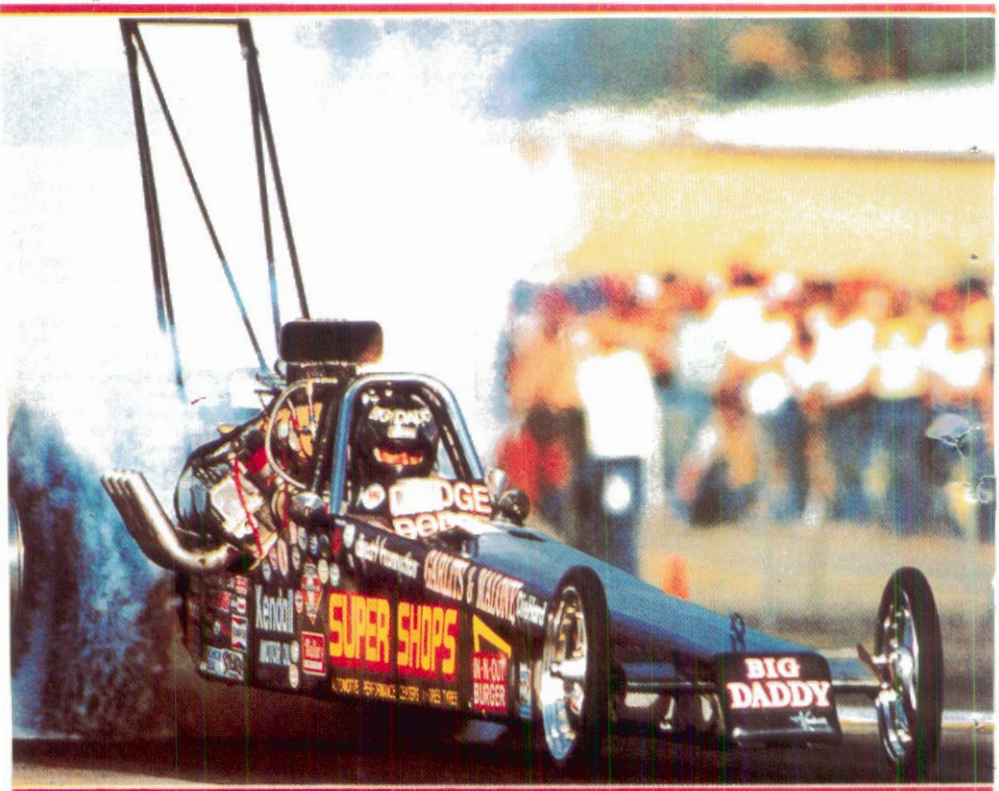

عجیب و غریب کار کی تیز رفتاری

تصویر میں آپ کو جو عجیب و غریب کار نظر آ رہی ہے اس کا نام "بگ ڈیڈی" ہے اور اس کار کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس کے ڈرائیور DON GARLITS نے بگ ڈیڈی کو ۴۳۱ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا کر تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا۔

تازہ ایجادات

خالد خلیل

مستقبل کی موٹر کار

یہ گاڑی کیلیفورنیا کے آرٹ سینٹر کالج کے ایک طالب علم نے تیار کی ہے اس گاڑی کو سائنسدانوں نے اکیسویں صدی کے لئے ایک کامیاب ترین گاڑی قرار دے رہے ہیں سائنسدان اس گاڑی کو مزید ترقی دیکر اس کو دفاعی استعمال کیلئے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس گاڑی میں پانچ افراد سوار ہو سکتے ہیں اور یہ صاف سڑک سے لیکر پتھریلی زمین تک پر چل سکتی ہے۔

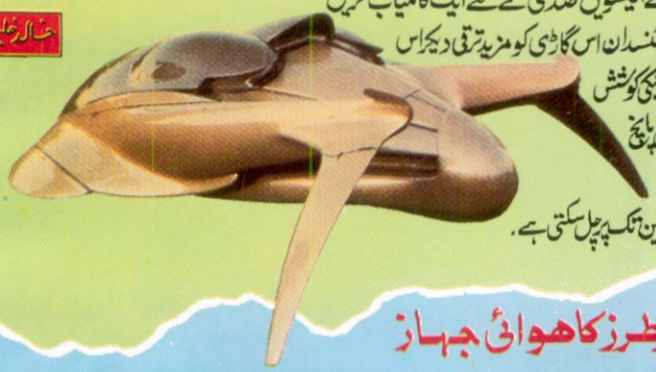

ہیلی کاپٹر طرز کا ہوائی جہاز

اس چھوٹے سائز کے ہوائی جہاز کو بالکل ہیلی کاپٹر کے انداز میں بنایا گیا ہے اور یہ آسانی کے ساتھ کسی بھی چھوٹی سی جگہ یا بلڈنگ وغیرہ کی چھت پر اُتر سکتا ہے اور پرواز بھی کر سکتا ہے۔ اس جہاز کو وولکن ایئر کرافٹ کارپوریشن نے تیار کیا ہے اور اس میں آٹھ سے دس افراد بہ آسانی سفر کر سکتے ہیں۔

رنگین ویڈیو فون

یہ ہے سائنس کی ایک اور حیرت انگیز ایجاد، رنگین ویڈیو فون۔ یہ ویڈیو فون آنے والے دنوں میں بے حد عام اور تقریباً ہر گھر میں موجود ہوگا یہ عام ٹیلی فون لائنوں پر کام کریں گے۔ اس ویڈیو فون کی مدد سے آپ اپنے دوستوں وغیرہ کی گفتگو ان کی تصویر کے ساتھ اپنے پاس وی سی آر وغیرہ میں محفوظ بھی کر سکیں گے۔ اس کمپیوٹر ویڈیو فون کی قیمت فی الوقت ۱۴,۴۰۰ ڈالر ہے

ایک تھی مینڈکی

عبدالقادر

اک مینڈکی رہتی تھی کسی جھیل کے اندر
بے حد اسے محبوب تھا ایک سرمئی بندر

بندر کا ٹھکانا تھا وہیں جھیل سے کچھ دور
ملتی، تو بڑے پیار سے کہتا تھا اسے حُور

اک دن وہ ملاقات کو رخصت ہوئی گھر سے
یوں کہنے لگی چلتے ہوئے، اپنے پسر سے

اے لختِ جگر! گھر میں رہو خوف نہ کھاؤ
نظارہ کرو جھیل کا اور لطف اٹھاؤ

لازم ہے کروں آج میں بندر سے ملاقات
ملنے کے لئے دن ہیں یہی پیر و جمعرات

ہے چاروں طرف موت، یہ بتلا دیا ہَوّا
نکلو گے اگر گھر سے تو کھا جائے گا کوا

جنگل میں گئی جب وہ پھدکتی ہوئی گھر سے
اک بیل جو پیاسا تھا، چلا آیا ادھر سے

دیکھا نہ تھا معصوم نے اتنا بڑا حیوان!
وہ بیل نظر آیا تو بے حد ہوا حیران

ماں لوٹ کے جب آئی تو بچّے کی زُبانی
سنتی ہی رہی شوق سے حیواں کی کہانی

پھر کہنے لگی لعل مرے یہ تو بتا دے
کیا اتنا بڑا تھا، ذرا احوال سنا دے

یہ بات جو پوچھی تو عمل کرکے دکھایا
منہ اتنا پھُلایا کہ اسے گیند بنایا

وہ کہنے لگا اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا
میں ڈر ہی گیا جب وہ یہاں آکے کھڑا تھا

وہ منہ کو بناتی رہی طاقت سے غبّارہ
"کیا اتنا بڑا تھا" یہی کرتی تھی اِشارہ

وہ بولا مرے دل پہ اثر گہرا پڑا تھا
امی وہ ہزاروں گُنا ابّو سے بڑا تھا

منہ اپنا پھلاتی رہی طاقت سے برابر
سوچا ہی نہیں اس میں ہے نقصان سراسر

بڑھتا ہی رہا زور تو منہ پھٹ گیا اس کا
ہلکے سے دھماکے پہ ہوا خاتمہ اس کا

انسان کو لازم ہے کرے عقل سے ہر کام
جو عقل سے کورا ہے، بُرا اس کا ہے انجام

بوجھو تو جانیں

ادارہ

مرسلہ: محمد علی سفیر، کراچی

۱۔ جب لگتی ہے سر پہ چوٹ
لیتی ہے دیوار کی اوٹ

۲۔ گھر سے نکلا دھکّا کھا کر
دکھلاؤ تو واپس لا کر

۳۔ آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بجھے نہ لیک دیا

۴۔ منہ میں ڈال کے ہر لیک کھا لے
لگ جائے تو جان نکالے

۵۔ خود کبھی وہ کچھ نہ کھائے
لیکن آپ کو خوب کھلائے

۶۔ جس نے پایا لیک ہی پایا
پھر وہ کام ہمیشہ آیا

۷۔ ہے کھڑا ہو صبح یا شام
چلنا پھرنا اُسے حرام

۸۔ اگرچہ وضو کرتا نہیں دیتا ہے اذانیں
کیا نام ہے اس شوخ کا بوجھو تو جانیں

۹۔ نیچے سے وہ اوپر جائے
پھر وہ کیسے نیچے آئے

۱۰۔ دھوپ کبھی نہ اسے سُکھائے
سُوکھا جب سائے میں آئے

۱۱۔ موتی سچّے تھے یا جھوٹے
ہاتھ کے لگتے ہی سب ٹوٹے

۱۲۔ آپ نے اُسے گلے لگایا
اُس نے آپ کا گلا دبایا

۱۳۔ بات چھپے نہ اس سے اصلی
گِن لے سب کی ہڈی پسلی

۱۴۔ خشکی پر نہ اس کو پاؤ
پانی میں اُترو تو کھاؤ

۱۵۔ جوں جوں آگے قدم بڑھائے
اپنا نشان مٹاتی جائے

ہمیں بہت سے ساتھیوں کے خطوط ملتے ہیں جس میں اس بات کی شکایت کی گئی ہوتی ہے کہ ان کا نام انعامی مقابلہ، بوجھو تو جانیں، یا "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" میں شامل نہیں کیا گیا۔ جبکہ تمام جوابات درست تھے۔ ایسے ساتھیوں کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ خطوط جو ماہ رواں کی ۱۲ تاریخ کے بعد موصول ہوں یا دونوں مقابلوں کے جوابات ایک ہی کاغذ پر لکھے گئے ہوں، یا جوابات کے ساتھ نام اور پتا نہ لکھا گیا ہو، مقابلے میں شامل نہیں کئے جاتے۔ یہ تینوں بنیادی شرائط ہر مقابلے کے ساتھ باقاعدہ شائع کی جاتی ہیں۔ مقابلہ میں شریک ہونے کے لئے ان تینوں شرائط کا پورا کیا جانا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اس ماہ سے "بوجھو تو جانیں" کے سلسلے میں ایک تبدیلی کی جارہی ہے۔ چونکہ اکثر ساتھی ملتی جلتی پہیلیاں بھیج دیتے ہیں۔ اور کسی ایک ہی فرد کی بھیجی گئی پہیلیوں میں سے ایک یا دو پہیلیاں قابل اشاعت ہوتی ہیں۔ اس لئے پہیلیاں ارسال کرنے والے ساتھی کو دیئے جانے والے تحفے کا سلسلہ ختم کیا جارہا ہے۔ البتہ جن ساتھیوں کی پہیلیاں چھپیں گی ان کا نام ضرور شائع کیا جائے گا۔ آئندہ ماہ سے انعامات بھی دو کے بجائے تین خوش نصیب ساتھیوں کو دیئے جائیں گے۔ (ادارہ)

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے درست جوابات

۱۔ ماں ۲۔ دُعا ۳۔ نبض ۴۔ تصویر ۵۔ بال ۶۔ غُلیل ۷۔ قینچی اور سوئی دھاگہ ۸۔ لوہا ۹۔ لکھا ہوا کاغذ ۱۰۔ دھواں ۱۱۔ حقہ

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی۔

۱۔ صباحت صبا، لاہور ۲۔ ملک حفیظ اللہ نیّر، بھکر

بالکل درست جواب دینے والے ساتھیوں کے نام

فہد سفیر، کراچی۔ محمد علی سفیر، کراچی۔ سیّدہ بینا جلالی، کراچی۔ صائمہ سفیر، کراچی۔ سہیل اکبر خان، لاہور۔ خالد سفیر، کراچی۔ زبیدہ سعید، کراچی۔ ثمینہ اکبر، لاہور۔ ارم خاتون۔ کراچی۔ مدیحہ صدیقی، کراچی۔ محمد علی صدیقی، کراچی۔ محمد فہاد مرزا، لسبیلہ۔ سمنان آخوند، کراچی۔ انعام اللہ، کراچی۔ محمد احسن محسن خان، کراچی۔ نوشین اختر، کراچی۔ حنیف ابراہیم، کراچی۔ شمس الدین خواجہ، کھوڑ۔ نوید اسلم، لوبہ نیک سنگھ۔ صائمہ کلیم، کراچی۔ اسامہ آصف حسین، کراچی۔ کنیز فاطمہ، کراچی۔ قرۃالعین محمود، کراچی۔ صائمہ زہرہ، حیدر آباد۔ ہما کریم، کراچی۔ فرحین محمود، کراچی۔ شیبا گل، کراچی۔ عافیہ صغرا، خوشاب۔ رقیہ منظور، اٹک۔ محمد سرور، پھلجی۔ ممتاز علی، پھلجی۔ محمد بلال حسنین، لاہور۔ حافظ محمد شاہد فاروقی، میلسی۔ ابوذر مرتضیٰ معاویہ فاروقی، میلسی۔ ندا محمد طارق، ساہیوال۔ محمد رفیق قریشی، حیدر آباد۔ غلام عباس، بھکر۔ عبدالسلام غوری، بھکر۔ جاوید اقبال، بھکر۔ سہیل عباس، ساہیوال۔ محمد قاسم، کراچی۔ محمد عرفان، کراچی۔ فیصل رفیع مغل، حضرو۔ منیرہ حیدر، کراچی۔ سیّد یاسر حسین نقوی، کراچی۔ شہناز صدف، کراچی۔ سعدیہ انجم، کراچی۔ تابندہ حسنین، لاہور۔ فہد انصاری، کراچی۔ مونا شوکت، فیصل آباد۔ صائمہ محمود، کراچی۔ رفاقت مسرور، بنوں۔ عالیہ صلاح الدین، کراچی۔ ریحان خان، حیدر آباد۔ محمد مکرّم اعجاز، سمیرا جبیں، ملتان۔ ذکیہ زیدی، راولپنڈی۔ محمد علی چوہان، ملتان۔ سائرہ عباس، (؟) ساجد کمالوی، کمالیہ۔ زاہد شیرازی، بھکر۔ خرم شیرازی، بھکر۔ شاہد شیرازی، بھکر۔ صائمہ شبیر، اسلام آباد۔ بابر کمال، راولپنڈی۔ عمران ساجد، پشاور۔ عبدالشکور، نواب شاہ۔

وزیر احمد، کراچی۔ مبر احمد نواز لیل، شور کوٹ۔ نعمان احمد، اسلام آباد۔ شعیب اعوان، سیالکوٹ۔ سید محمد اصغر عباس نقوی۔ اسلام آباد۔ اشفاق احمد قریشی، آزاد کشمیر۔ امجد [illegible]، کراچی۔ سید جنید علی، کراچی۔ جاوید اقبال عاجز، دونگہ بونگہ۔ نواب علی، چارسدہ۔ محمد سلیم، حیدر آباد۔ طاہر محمود، ہری پور۔ محمد حسّان رضا خان لودھی، حیدر آباد۔ نمر فواد مرزا، اٹک۔ آصف وقار آصف، واہ کینٹ۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ انیل حسنات، کمالیہ۔ جواد مجیب، گوجرانوالہ۔ محمد کامران خان، حیدر آباد۔ محمد عمران، لاہور۔ عاطف زمرّد ملک، راولپنڈی۔ اسماء یاسمین، قصور۔ شہزاد احمد، کوئٹہ۔ صفیہ انجم صدیقی، جیکب آباد۔ راجہ نعیم شوکت، کراچی۔ عبدالرزاق ساغر، لاہور۔ سید احسن علی، کراچی۔ محمد فاروق منیر، لاہور۔ معراج الدین، کراچی۔ محمد جاوید، جھنگ صدر۔ مشرف سہیل، لاہور۔ عبدالحکیم، سیالکوٹ۔ شباب باہو، بھکر۔ رخسانہ کوثر، کراچی۔ نعمان صدیق، لالہ موسیٰ۔ محمد اعجاز پرنس، راولپنڈی۔ احسان الرحمٰن خالد، لاہور۔ خاور جعفری، کراچی۔ قرۃ العین ضیاالدین، کراچی۔ حمنہ کرن اشرف، نجم السحر اشرف، محمد زوہیب اشرف، مسرت خان رانی، سہیل اختر خان، سجیل اختر خان، انیل اختر خان، جاوید اختر خان، کراچی۔ مظہر اقبال، کماریاں۔ عبداللہ خورشید احمد، ہری پور ہزارہ۔ سید کاشف علی، کھٹھہ۔ صبیحہ مسعود، راولپنڈی۔ حافظ رفاقت علی، سرگودھا۔ امبر غفار، کراچی۔ آغا وسیم حیدر، کراچی۔ آغا منصور حیدر، کراچی۔ کرن افضل، اسلام آباد۔ قرۃ العین فخر، ہری پور۔ محمد زبیر مسلم، فیصل آباد۔ فرخ عباس، بھکر۔ خرم شہزاد، بھکر۔ محمد محفوظ احمد، جہلم۔ آصف وریام، کراچی۔ رانی بلقیس بانو، منڈی مرید کے۔ محمد عثمان سلیم، لاہور۔ فوزیہ شازیہ، سکھر۔ نوید احمد، چکوال۔ محمد علی جواد، لاہور۔ انعام حیدر، راولپنڈی۔ خرم بلال، گجرات۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ عبدالوحید، بھکر۔ اسماعیل حمید بلوچ (؟) محمد انور باری، مری۔ نبیل جواد، (؟)۔ عائشہ شیخ، (؟)۔ مدیحہ امید، فیصل آباد۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔ شکیل احمد، پشاور۔ نوشین ناز، پشاور۔ محمد علی شاکر، سرگودھا۔ فوزیہ خانم، سرگودھا۔ نازیہ خانم، سرگودھا۔ مہرین اختر، سرگودھا۔ مقبول احمد، سرگودھا۔ اعجاز احمد شاہین، سرگودھا۔ نوید تاج، چشتیاں۔ محمد عرفان، پشاور۔ محمد عبداللہ، بہاول نگر۔ ناہید غنی، گوجرانوالہ۔ محمد خرم قاضی، اسلام آباد۔ خاور شاداب، بھکر۔ اورنگ زیب زیدی، آزاد کشمیر۔ آصف شہزاد، فیصل آباد۔ اقراء باری، فیصل آباد۔ ثمینہ ناز، کراچی۔ محمد نعمان فیروز، لیہ۔ طاہر اقبال چوہدری، سرگودھا۔ سید محمد عارف، منڈی مرید کے۔ زاہد اقبال چوہدری، سرگودھا۔ محمد جمیل جیمی، خان پور۔ نادیہ خالد، کراچی۔ خلیل احمد تبسم، باغ وبہار۔ رستم علی، گجرات۔ مہوش فراز، لالہ موسیٰ۔ فائزہ مجلد الرحمٰن، لاہور۔ مریم خواجہ، راولپنڈی۔ رومانہ علی اکبر، لاہور۔ محمود اقبال، راولپنڈی۔ تصور قیوم چغتائی، لاہور۔ محمد اشرف گھانچی، حیدر آباد۔ صائمہ سلیم، کراچی۔ سید عدیل عباس نقوی، شیخوپورہ۔ آسیہ رحمت، ساہیوال۔ زاہدہ رحمت، ساہیوال۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ ایم اظہر خان بلوچ، بھکر۔ شاہد امین، لاہور۔ کرن، راولپنڈی۔ عمران نواز، دینہ۔ کامران بخاری، بہاولپور۔ اسماء تھانوی، کراچی۔ فوزیہ ظفر، حیدر آباد۔ گل فراز خان بٹ کھوڑی، کہوٹہ۔ نذر فرید خان، عدنان صابر، خانیوال۔ قرۃ العین عبدالرشید، کراچی۔ نازیہ سید نازی، بھکر۔ شاہدہ علی، راولپنڈی۔ یاسر ربانی، اسلام آباد۔ کاشف قدیر، ڈیرہ اسماعیل خان۔

اس کے علاوہ ہمیں ہزاروں خطوط ایسے موصول ہوئے جن میں ساتھیوں نے ایک غلط جواب دیا تھا اور سیکڑوں ایسے جن میں ایک سے زیادہ غلطیاں تھیں مگر جگہ کی کمی باعث ان سب کے نام شائع نہیں کئے جا سکے۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

بچاؤ

بچّوں کے مقبول مصنّف اشتیاق احمد کے قلم سے

انسپکٹر جمشید کے دروازے پر دستک ہوئی..... کسی نے گھنٹی کا بٹن دبانے کے بجائے، دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارا تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کوئی بہت گھبراہٹ میں ہے۔" یہ کہتے ہی محمود دروازے کی طرف دوڑا۔

"اللہ اپنا رحم کرے۔" فاروق نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"لیکن! یہ کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے!" فرزانہ قدرے تیز آواز میں بولی۔

"دیکھا جائے گا..... زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کوئی مصیبت زدہ ہے..... دستک کا انداز یہی کہہ رہا ہے۔" محمود بولا۔

ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا..... ایک آدمی آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوا اور پھر اس نے خود ہی دروازہ بند کر دیا..... اب جو وہ ان کی طرف مڑا تو اس کی حالت دیکھ کر وہ لرز اٹھے۔

اس کے چہرے پر، ہاتھوں پر، پہنے ہوئے کپڑوں پر..... ٹانگوں پر، غرض ہر جگہ خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔

"آ..... آپ تو کافی حد تک خون آلود ہیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا، تڑ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا! بیگ فرش پر گر گیا۔

"یہ جواب دینے کا کون سا طریقہ ہے!" فاروق گھبرا گیا۔

تینوں نے مل کر اسے اٹھایا اور ایک کمرے میں لا کر بستر پر ڈال دیا..... اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے، وہ سردیوں کی ایک رات تھی اور سردیوں کی رات میں وہ تینوں گھر میں اکیلے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور ان کی والدہ ایک شادی میں گئے ہوئے تھے۔ شادیوں میں شرکت کرنا انسپکٹر جمشید کو پسند نہیں تھا لیکن کسی قریبی عزیز کے ہاں جائے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا اور آج تو ان کے بچپن کے دوست کے بیٹے کی شادی تھی..... اس لئے جانا ہی پڑا۔ تاہم انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ نہیں لیا تھا..... وہ شادیوں میں شرکت کرنے سے ان کی نسبت کہیں زیادہ گھبراتے تھے..... ان کا خیال تھا کہ شادیوں میں وقت بُری طرح برباد کیا جاتا ہے، بلکہ سب کے سب وقت کو برباد کرنے پر تُلے نظر آتے ہیں۔

"کیا خیال ہے..... ڈاکٹر صاحب کو فون کریں یا خود اسے ہوش میں لانے کی کوشش کریں؟" ننھے محمود نے ان کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب کو بُلانا مناسب نہیں ہو گا..... ہو سکتا ہے، یہ معاملہ راز کا ہو۔" فرزانہ نے مشورہ دیا۔

"میں فرزانہ کی تائید کرتا ہوں۔"

اب انہوں نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کیں..... آخر پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"مم..... میں..... میں کہاں ہوں۔"

"آپ کہاں پایا جانا پسند کریں گے؟" فاروق نے پوچھا..... محمود اور فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ان..... انسپکٹر جمشید کے گھر۔"

"تب تو آپ بالکل دُرست جگہ پر موجود ہیں۔"

"اوہ..... یا اللہ تیرا شکر ہے..... کیا گھر کے

تمام دروازے اندر سے بند ہیں؟"

"ہاں کیوں ..... کیا آپ کے پیچھے دشمن لگے ہیں؟"

"دشمن! بھوکے بھیڑیئے کہہ سکتے ہیں، آپ انہیں۔"

"اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو ہم اب ان لوگوں کو بھوکے بھیڑیئے ہی کہہ کر مخاطب کریں گے۔" فاروق مسکرایا۔

"لیکن یہ تو فرمایئے ..... آپ ہیں کون؟" محمود نے پوچھا۔

"انسپکٹر جمشید ....." اس نے کہا۔

"کیا کہا! آپ انسپکٹر جمشید ہیں؟ اس کا مطلب ہے، اس نام کے ہمارے ملک میں ایک اور صاحب بھی ہیں، یہ جان کر خوشی ہوئی ..... اور اس سے بڑھ کر خوشی اس بات کی ہوئی کہ انسپکٹر جمشید، انسپکٹر جمشید کے گھر آئے ہیں۔" فاروق جلدی جلدی بولا۔

"آپ غلط سمجھے۔" اس نے فوراً کہا۔

"یہ اس کی عادت ہے۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"آپ کا اشارہ کسی عادت کی طرف ہے؟"

"غلط سمجھنے کی عادت کی طرف۔" محمود مسکرایا۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ انسپکٹر جمشید کہاں ہیں؟ یہ میں انہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔"

"وہ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئیں گے ..... اور کیا آپ کو یقین ہے کہ دو گھنٹہ تک آپ زندہ رہیں گے؟" محمود نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔

"نن نہیں ..... مجھے تو دو پل کا نہیں پتا۔"

"تو پھر آپ ہمیں بتا دیں ..... کیونکہ ہمیں بتانا بھی انہیں بتانے کے برابر ہے۔"

"مم ..... میرا بیگ کہاں ہے؟"

"بیگ ..... اوہ ہاں، اس کو تو ہم بھول ہی گئے ..... وہ وہیں ..... دروازے کے پاس پڑا ہوگا۔"

"کیا!!!" وہ چلّا اٹھا ..... انداز میں خوف تھا۔

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے، دروازے تو اندر سے بند ہیں ..... ایک منٹ ..... میں ابھی بیگ اٹھا کر لاتا ہوں۔"

"شش ..... شکریہ۔"

"آپ نے بے چارے شکریئے کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔" فاروق بولا۔

"جی ..... کس کے دو ٹکڑے کر دیئے؟" وہ اُچھل پڑا۔

"شکریئے کے۔" فاروق نے کہا۔

"آپ عجیب ہیں۔" وہ بھنّا اٹھا۔

"ہاں! عجیب تو میں ہوں ..... اِدھر دیکھئے ..... یہ غریب ہیں۔"

"کون ہیں ..... میں کیوں ہوتی غریب ؟" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

اس وقت محمود اندر داخل ہوا۔ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"اس کو کھولیں۔"

"کک ..... کہیں اس میں کوئی بم تو نہیں ہے۔"

"نہیں ..... بموں کے دادا جان ہیں اس میں۔" وہ مسکرایا۔

"اس کے چہرے پر ..... زخموں سے چور چہرے پر مسکراہٹ بھی کچھ بکھری بکھری لگی۔ ہمیں پہلے آپ کے زخموں کی مرہم پٹی کرنا چاہئے۔

"نن نہیں ..... پہلے ضروری کام کرنا ہوگا ..... بیگ کو کھولیں۔

"عین اس وقت دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

"آ گئے ..... بھوکے بھیڑیئے آ گئے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں ..... ہم ان کے آگے کچھ گوشت ڈال کر آتے ہیں۔" محمود نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"نن ..... نہیں ..... نہیں ..... آپ دروازہ ہرگز نہ کھولئے گا ..... فوراً پولیس کو فون کریں ..... کہ ان لوگوں کو اندر داخل ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا جائے ..... آپ نہیں جانتے ..... میں کس قدر خطرے میں ہوں ..... بلکہ میں نہیں مُل....."

اس وقت دروازہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے پیٹا گیا، اس کے الفاظ اس آواز میں دب گئے .....

"آپ کیا کہہ رہے تھے ..... بلکہ میں نہیں مُل۔"

"پہلے آپ اس بیگ کی فکر کریں ..... وہ میری جان بے شک لے لیں، یہ بیگ ان کے ہاتھ نہیں لگنا چاہئے ..... اس میں امانت ہے امانت۔" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

"اب ہم پہلے بیگ کو کہیں چھپائیں گے ..... پھر ان سے بات کریں گے ٹھیک ہے ؟"

"ہاں! بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

تینوں بیگ لے کر فوراً کمرے سے نکل گئے ..... دروازہ بدستور دھڑ دھڑایا جا رہا تھا ..... تین منٹ بعد وہ پھر زخمی کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"بیگ کو ہم نے چھپا دیا۔"

"آپ کو یقین ہے ..... اگر وہ اندر آ گھسے تو اس بیگ کو تلاش نہیں کر سکیں گے۔"

"نہیں کر سکیں گے۔"

"وہ نہ کر سکیں ..... لیکن وہ آپ سے اگلوا تو سکتے ہیں۔"

"پہلے آپ یہ بتا دیں ..... اس بیگ میں ہے کیا؟"

"صرف یہ جان لیں کہ اس ملک کی ایک امانت ہے اس میں۔"

"اگر بات ہمارے ملک کی امانت کی ہے تو پھر وہ ہم سے کچھ نہیں اُگلوا سکیں گے۔"

"دیکھ لیں ..... وہ بھوکے بھیڑیئے ہیں۔"

"فاروق! انکل اکرام کو فون کرو ..... وہ فوراً فورس لے کر یہاں پہنچیں۔"

فاروق نے فون کی طرف دوڑ لگا دی ..... دروازے پر دھڑا دھڑی اب اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔

"وہ بھوکے بھیڑیئے ہوں یا بھوکے شیر ..... ہم سے بیگ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔" محمود نے کہا۔

"اب میں اطمینان سے مر سکوں گا۔"

"لیکن کیوں ..... آپ کو مرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"یہ لوگ اب مجھے کہاں چھوڑیں گے!"

"کیا آپ کو اپنے اللہ پر بھروسہ نہیں؟" محمود نے کہا۔

"وہ تو ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"اور کیا آپ کو معلوم نہیں ..... مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے ..... یعنی اللہ۔"

"ہاں! یہ بات بھی ہے۔"

"تب پھر اللہ کو یاد کریں ..... ان لوگوں سے نپٹنے کے لئے ہم جا رہے ہیں۔"

اب دونوں کمرے سے نکلے، اسی وقت فاروق فون کے پاس سے پلٹا۔

"انکل نہیں آرہے۔"

"کیوں ..... کیا وہ اپنے دفتر میں نہیں ہیں۔"

"پتا نہیں ..... فون کے تار کاٹ دیئے گئے ہیں۔"

"اوہ نہیں!" ان دونوں کے منہ سے نکلا۔

پھر تینوں دروازے پر آئے

"ٹھہرو ..... یہ کیا طوفان بدتمیزی مچا رکھا ہے تم نے۔"

"کانوں پر جوں رینگ گئی۔" باہر سے کہا گیا۔

"ہاں رینگ گئی ..... اب تمہارے لئے محفوظ کر لی ہے۔" فاروق بولا۔

"کیا محفوظ کر لی ہے؟"

"جوں ..... تاکہ تمہارے کانوں پر بھی رینگ سکے۔"

"بکو مت ..... دروازہ کھولو ..... ورنہ توڑ دیں گے۔"

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟"

"دروازہ کھولو۔" کسی نے غرا کر کہا۔

"اور اگر ہم نہ کھولیں ..... تو؟"

"تو ہم توڑ ڈالیں گے۔"

"ٹھیک ہے..... آپ اپنا یہ شوق پورا کر لیں، آپ کو بِل مل جائے گا۔"

"بِل مل جائے گا! کس چیز کا بِل؟"

"دروازے کی مرمت کا..... اور کس کا۔" فاروق نے کہا۔

"توڑ دو دروازہ..... اس گھر میں شاید باتوں کے نہیں، لاتوں کے بھوت..... ارے..... یہ کیا؟"

کہنے والے کے الفاظ درمیان میں رہ گئے..... اس کے لہجے سے بے پناہ حیرت اور خوف ٹپک رہا تھا۔

"کیا ہوا بھائی..... کک..... کہیں تمہیں سانپ تو نہیں سونگھ گیا..... مم مگر نہیں..... ہمارے دروازے پر سانپ کہاں سے آگیا؟" فاروق جلدی جلدی بولا۔

"یہ..... یہ گھر تو..... انسپکٹر جمشید کا ہے۔" باہر کسی نے کہا۔

"لوہ..... یہ..... یہ بُرا ہوا۔" دوسرا بولا۔

"برا ہوا یا اچھا..... ہمیں اپنا کام تو کرنا ہی ہوگا۔"

"کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"اب لینے کے دینے پڑیں یا دینے کے لینے..... دروازہ توڑ ڈالو....." کسی نے غرا کر کہا۔

"بہت بہتر استاد۔"

"خبردار..... اگر تم لوگوں نے دروازہ توڑا تو ہم بھی تمہیں توڑ مروڑ کر رکھ دیں گے..... پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔" اندر سے فاروق بول اٹھا۔

"ہمارے پڑوسیوں نے شاید کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے..... اس سارے ہنگامے کی انہیں خبر تک نہیں ہوئی۔"

"بھئی سردی کے دن ہیں..... لوگ لحافوں میں دُبکے سو رہے ہیں..... جو جاگ رہے ہیں وہ ٹی وی لگائے بیٹھے ہوں گے....."

"بیگم شیرازی تک ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔"

"کیا خبر..... سو ہی گئی ہوں..... اور انہوں نے پولیس کو فون کر بھی دیا ہو۔"

"لیکن ہمیں اس بھروسے پر نہیں رہنا چاہیے....."

"ہوں..... ابا جان اور امی جان بھی واقعی دو گھنٹے سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔"

"کوئی بات نہیں..... ہم کوئی موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔"

"پتا نہیں اس بیگ میں کیا ہے؟ یہ زخمی اجنبی کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور باہر موجود لوگ کون ہیں؟؟؟"

عین اس وقت دروازے کے چند قبضے اکھڑ گئے..... ایک پٹ تھوڑا سا کھل گیا..... اس میں سے فوراً کلاشن کوف کی نالی جھانکنے لگی۔

(آگے کیا ہوا؟ آئندہ شمارے میں پڑھیے)

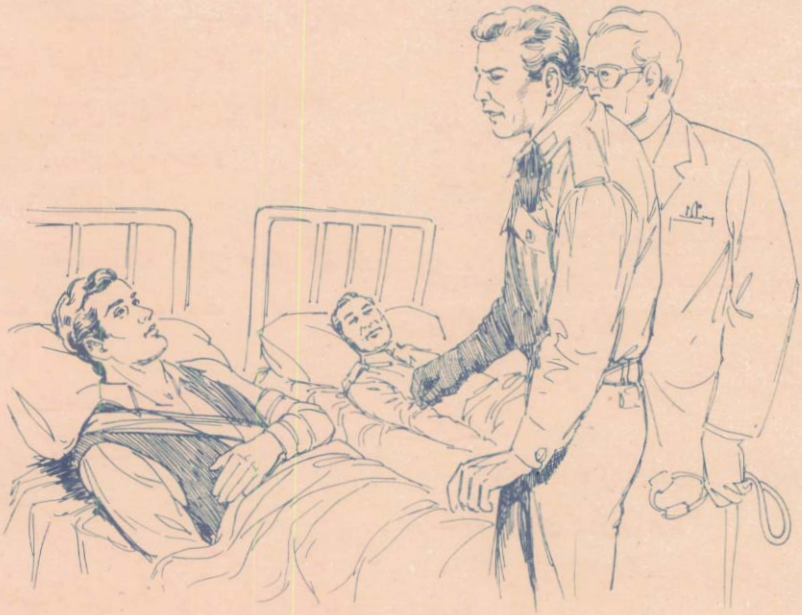

انوکھا تجربہ

محمد عادل منہاج

اچانک گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور ایک شخص گر کر تڑپنے لگا۔ وہاں پہلے ہی کچھ لوگ کھڑے تھے اب تو اور ہجوم جمع ہو گیا "تت..... تم نے اسے مار ڈالا۔" ایک بوڑھا تھر تھراتی آواز میں بولا۔

"نن..... نہیں..... یہ خود بلاوجہ مجھ سے لڑ رہا تھا۔ اس نے خود ہی میری بندوق پر ہاتھ ڈالا تھا تو اچانک ٹریگر دب گیا۔" بندوق والا شخص گھبرا کر بولا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جناب..... غلطی مارٹن کی ہی تھی۔ دوسرے شخص نے زخمی کی طرف

اشارہ کیا۔

"ارے غلطی کسی کی بھی ہو، اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو، اس کے معدے میں گہرا زخم آیا ہے۔"

"ہاں ہاں..... اٹھاؤ اسے۔" بندوق والے نے بندوق اپنی دُکان میں رکھی اور سب اسے اُٹھا کر ڈاکٹر کے کلینک لے آئے۔ "اُف! اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ زندہ کس طرح ہے۔" ڈاکٹر نے زخمی کو حیرت سے دیکھا۔ گولی نے اس کے دائیں طرف بڑا سا سُوراخ کر دیا تھا۔ اتنا بڑا کہ انسانی ہاتھ اندر ڈالا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً دوائیں لگا کر پہلے تو خون بند کر دیا۔

"اس کی حالت کچھ سنبھل جائے تو میں آپریشن کر کے ٹانکے لگا دوں گا۔ اس وقت تک یہ یہیں داخل رہے گا۔ اس کے گھر والوں کو خبر کی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ تو بالکل اکیلا ہے۔" ایک شخص نے بتایا۔

لوگ اسے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ کافی دیر بعد مارٹن کی آنکھ کھلی۔ اس کی حالت کافی بہتر تھی۔

"فکر نہ کرو..... تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔" ڈاکٹر نے تسلی دی۔

اگلے دن ڈاکٹر نے اس کا آپریشن کرنا چاہا تو مارٹن نے انکار کر دیا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب آپ بس دوائیں لگاتے رہیں، زخم خود ہی بھر جائے گا۔ میں آپریشن نہیں کرواؤں گا۔" ڈاکٹر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ وہ زخم کو برداشت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک سال گزر گیا۔ اس دوران اس کا زخم کافی بھر چکا تھا مگر معدے کا وہ حصہ جہاں سُوراخ تھا وہ جلد کے ساتھ چپک گیا تھا اور جلد میں اب ایک چھوٹا سا سُوراخ رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی بڑی انگلی آسانی سے سُوراخ کے ذریعے معدے میں داخل کر سکتا تھا۔

"وقت گزرتا رہا۔ مارٹن اس دوران بیروزگار ہوا تو ڈاکٹر نے اسے کلینک میں ہی ملازم رکھ لیا اور اس کا علاج بھی جاری رکھا۔ اس کے معدے کے سُوراخ پر ڈاکٹر نے ٹیپ لگا دی تھی۔ تاہم سُوراخ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس میں سے غذا باہر نکل جائے، مارٹن آسانی سے کھا پی سکتا تھا۔

سُوراخ پر لگی ٹیپ پرانی ہو گئی تو ڈاکٹر نے ٹیپ اتار دی۔ وہ نئی ٹیپ کا ٹکڑا چپکانے ہی والا تھا کہ اچانک اسے ایک انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ سُوراخ سے معدے کے اندر جھانک کر دیکھا جائے کہ خوراک کس طرح ہضم ہوتی ہے۔ اب تک سائنس دانوں نے صرف اندازے لگائے تھے کہ معدے کی دیواروں سے ہضمی رس نکلتا ہے، جس میں نمک کا تیزاب شامل ہوتا ہے، جو خوراک ہضم کرتا ہے۔ مگر ان باتوں پر کسی کو یقین نہ تھا۔ آج یہ بات ثابت ہو سکتی تھی کہ ایسا ہوتا

ہے۔ یا نہیں۔ ڈاکٹر نے فوراً اس کے سوراخ سے آنکھ لگا دی۔

"یہ..... یہ تم کیا کر رہے ہو ڈاکٹر؟" مارٹن نے حیرانی سے پوچھا۔

"خاموش..... چپ چاپ بیٹھے رہو۔" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔ اسے معدے کے اندر پانچ چھ انچ تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک انوکھی دنیا تھی جو آج تک کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ڈاکٹر پر جوش کی کیفیت طاری تھی۔ وہ اچانک اٹھا اور کچن کی طرف دوڑا پھر وہ ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے اٹھا کر لایا۔

"تت..... تم کیا کرنا چاہ رہے ہو!؟" مارٹن کچھ پریشان ہو گیا۔

"میں آج وہ کام کرنے لگا ہوں جو دنیا میں آج تک کسی نے نہیں کیا۔ بس تم تھوڑی دیر ایسے ہی بیٹھے رہو۔" ڈاکٹر نے کہا اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے سوراخ میں سے اس کے معدے میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے آنکھ لگا کر دیکھا کہ معدے کا اندرونی گلابی آستر فوراً چمکنے لگا تھا۔ یہ گویا سگنل تھا کہ معدے میں خوراک پہنچ چکی ہے۔ پھر معدے کی دیواروں سے بے شمار ننھے ننھے قطرے ٹپکنے لگے اور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے۔ جلد ہی ڈبل روٹی گھل گئی۔

"وہ مارا! آج میں نے ہاضمے کا عمل دیکھ لیا۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔" ڈاکٹر چلایا۔ اگلے دن ڈاکٹر نے ربڑ کی نلکی کے ذریعے معدے سے کچھ ہضمی رس نکال کر ایک شیشی میں جمع کر لیا اور پھر گوشت کی بوٹیاں اس شیشی میں ڈال دیں۔ پھر اس نے شیشی کو انسانی جسم کے درجۂ حرارت تک گرم کیا۔ یہ ایک عظیم تجربہ تھا، جو آج سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ اب تک صرف اندازے لگائے گئے تھے مگر ڈاکٹر نے ان اندازوں کو سچ ثابت کر دکھایا۔

چالیس منٹ بعد بوٹیوں کے اوپر کے حصے پر ہاضمے کا عمل شروع ہوا۔ دو گھنٹے بعد گوشت، بوٹیوں سے باریک ریشوں اور دھاگوں کی صورت میں تبدیل ہوا اور بالکل گل گیا۔ دس گھنٹوں بعد یہ مکمل طور پر ہضم ہو چکا تھا۔ اس ہضمی رس کا ذائقہ نمک کے تیزاب جیسا ہی تھا۔

اس کامیاب تجربے کے بعد ڈاکٹر نے سوچا کہ یہ تجربے بڑے پیمانے پر کرنے چاہئیں اور ایک اعلیٰ درجے کی تجربہ گاہ بنانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے وہ مارٹن کو لے کر ایک سفر پر روانہ ہوا مگر مارٹن راستے میں کہیں بھاگ گیا۔ جس کا ڈاکٹر کو بے حد ملال ہوا۔ مارٹن ڈاکٹر کی ایک اتفاقیہ "دریافت" تھا جس پر اس نے ایسا تجربہ کیا جس سے نظامِ ہضم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے مارٹن کو ہر جگہ تلاش کیا آخر پورے چار سال بعد وہ ایک گاؤں میں ملا۔ اس دوران مارٹن شادی کر چکا تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے معاف کر دیا اور دوبارہ ملازم رکھ لیا۔ اب اس نے زخمی پر نئے تجربات شروع

کئے۔ اگرچہ اب وہ دونوں ساتھی بن چکے تھے مگر پھر بھی کبھی کبھار مارٹن اس کے تجربوں سے تنگ آجاتا اور ناراض ہوتا۔ ڈاکٹر نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ جب کبھی مارٹن ناراض ہوتا تو خوراک پوری طرح ہضم نہ ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غصے اور ناراضگی کی حالت میں ہضمی رس نکلنا کم ہو جاتا ہے اور خوراک بہت دیر میں ہضم ہوتی ہے۔

ایک بار مارٹن نے ڈاکٹر سے کچھ عرصے کی چھٹیاں مانگیں کہ وہ گاؤں اپنے بیوی بچوں سے مل آئے گا۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی مگر مارٹن ایسا گیا کہ پھر واپس نہ لوٹا۔ ڈاکٹر اپنی باقی ساری زندگی اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ یوں ڈاکٹر کی یہ انسانی دریافت کھو گئی لیکن اس پر کئے جانے والے تجربات کے باعث انسان کے نظامِ ہاضمہ سے متعلق بہت سے انکشافات ہوئے۔

یہ ڈاکٹر جس نے مارٹن پر انوکھے تجربات کئے "ولیم بیومونٹ" تھا جسے ۱۸۲۲ء میں سینٹ مارٹن، قدرت کے خفیہ رازوں سے پردہ اٹھانے کے لئے ایک زخمی کی صورت میں ملا۔ اگر مارٹن زخمی ہو کر اسے نہ ملا ہوتا یا وہ آپریشن کروالیتا اور اس کا سُوراخ بند ہو جاتا تو انسان کو نظامِ ہاضمہ سے متعلق یہ راز معلوم کرنے میں یقیناً کئی صدیاں لگ جاتیں۔

(ماخوذ)

چارلس ڈکنز

تقریباً ایک برس پہلے کرسمس کے موقع پر ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی۔ اس غیر فانی کتاب کو بہت سے لوگوں نے دنیا کی عظیم ترین چھوٹی کتاب کا درجہ دیا جس دن وہ کتاب شائع ہوئی، اس روز اس کی ایک ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں۔ اس دن سے وہ کتاب دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اس عالمی شہرت یافتہ کتاب کا نام کیا تھا۔ چارلس ڈکنز کی "کرسمس کیرل"!

تقدیر نے چارلس ڈکنز کو انگریزی ادب کا محبوب ترین ادیب بنایا تھا۔ اس کے باوجود جب اس نے لکھنا شروع کیا تو وہ دوستوں کے مذاق ہے اس قدر خائف تھا کہ اس نے اپنی پہلی کہانی کا مسودہ رات کی تاریکی میں ڈاک کے سپرد کیا کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے۔ جب بائیس (۲۲) برس کی عمر میں اس کی پہلی کہانی شائع ہوئی تو وہ سارا دن گلیوں میں بے مقصد گھومتا رہا۔ خوشی کے آنسو اس کی گال بھگو رہے تھے! اس کہانی کا معاوضہ اسے کچھ بھی نہ ملا۔ اگلی آٹھ کہانیوں پر بھی کچھ نہ ملا۔ آخر اسے ایک پونڈ کا چیک ملا۔ لیکن اسے اپنے آخری ناول کا معاوضہ تین پونڈ فی لفظ کے حساب سے ملا۔ ادب کی دنیا میں اتنا معاوضہ کسی ادیب کو نہیں ملا۔ غور کریں تین پونڈ فی لفظ!

چارلس ڈکنز کا بچپن نہایت غریب اور قابل رحم تھا۔ وہ ایک خستہ حال گھر میں رہتا تھا۔ اس کا والد قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے قید کر لیا گیا۔ کئی برس تک وہ غلاظت اور گندگی سے بھرپور جگہوں میں رہتا رہا۔ آخر کار اس کے ناولوں نے اس کو عزت و دولت کے آسمانوں پر پہنچا دیا!

حکیم کا جواب

خلیفۃ المتوکل علی اللہ جس کا دور حکومت ۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ مطابق ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء تک تھا کے زمانے میں ایک عظیم حکیم حسنین بن اسحاق تھا یہ بہت بڑا عالم فلسفی اور حکیم تھا جس کی رسائی رفتہ رفتہ خلیفۃ المتوکل علی اللہ کے دربار تک ہوگئی۔ یہ حکیم عیسائی مذہب کا تھا اور اپنے فن طبابت میں اس قدر ماہر و کامل تھا کہ اس کی اس عالمی شہرت کی وجہ سے خلیفہ کو یہ شبہ ہوگیا کہ شاید اس حکیم کی وساطت سے شہنشاہ روم جو حکیم کا ہم مذہب اور خلیفہ کا دشمن تھا، اس کی زندگی کے خلاف کوئی سازش نہ کرے۔ چناں چہ حسنین بن اسحاق کی آزمائش کے لئے خلیفہ نے اسے اپنے پاس بلا کر اسے بے حد مال و دولت اور جاگیر دینے کا وعدہ کر کے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک ایسا مہلک زہر تیار کرے جس کے کھلاتے ہی دشمن خاموشی کے ساتھ مر جائے۔ یہ سنکر حکیم نے پہلے امیر المومنین کے اس قدر مال و دولت دینے کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہا کہ اے امیر المومنین مجھے صرف انسانوں کے لئے فائدہ بخش ادویات بنانے کا علم ہے اور زہر یا مہلک دواؤں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس جواب پر خلیفہ کو غصہ آگیا اور اسے ایک قلعے میں بند کر دیا اور قتل کرنے کی دھمکی دی لیکن حکیم اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ اس نے قید کے دوران اپنا وقت یونانی زبان طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے میں گزارا۔ کچھ عرصے بعد خلیفہ نے حسنین کو پھر بلوایا اور اس کو ایک طرف ہیرے جواہرات اور مال و دولت کے انبار اور دوسری طرف کفن دفن و موت کے آلات کے درمیان کھڑا کر کے اس سے پھر وہی سوال کیا تو حکیم نے پھر وہی جواب دیا کہ میں انسان کے لئے صرف نفع بخش ادویات کا علم رکھتا ہوں اور زہریلی اشیا کا مجھے علم نہیں۔ یہ جواب سن کر خلیفہ نے اس کے قتل کا حکم دیا تو حسنین بن اسحاق نے خلیفہ سے کہا کہ خدا میرا بدلہ ضرور لے گا۔ چنانچہ حکیم کی نیک نیتی، سچائی اور ثابت قدمی سے متاثر ہو کر خلیفہ حکیم سے بغل گیر ہوگیا اور پوچھا کہ تم نے زہریلی دوا بنانے سے انکار کیوں کیا۔ حکیم حسنین بن اسحاق نے جواب دیا کہ امیر المومنین مذہب اور پیشہ طبابت نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا کیونکہ مذہب ہمیں دشمنوں سے بھی انسانیت کا برتاؤ کرنے کا حکم دیتا ہے اور پیشہ طبابت انسانوں کو نقصان و ایذا رسانی سے روکتا ہے کیوں کہ اس کی بنیاد انسان کی فلاح و بہبود پر ہے۔ اس کے علاوہ اطبا پر خدا کی طرف سے یہ بھاری ذمہ داری بھی عائد کر دی گئی ہے کہ وہ کوئی ایسی دوا ہرگز تیار نہ کریں جو مہلک و قاتل ثابت ہو۔ لہٰذا قانون مذہب اور قانونِ طب کے احکام کی خلاف ورزی کی مجھ میں طاقت نہیں تھی۔

ویٹر...... "سر! ہمارے ریستوران میں جدید ترین کچن موجود ہے یہاں ہر چیز بجلی پر پکائی جاتی ہے۔"

گاہک...... "بہت خوب! ذرا اس تکّے کو دو تین شاک اور لگوا لانا۔"

مرسلہ...... شاہ رخ احمد خان، نارتھ کراچی

○ .... ○ .... ○ .... ○

مائیکل فیراڈے نے اپنے زیرِ تربیت شاگرد کو ہتھوڑی بنانے کا حکم دیا۔ شاگرد کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہتھوڑی کس طرح بنائی جاتی ہے؟ اس نے استاد کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لئے بازار سے ایک ہتھوڑی خرید کر استاد کی خدمت میں پیش کر دی۔

"بہت خوب" فیراڈے ہتھوڑی دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ گیا۔ مسکرا کر بولا "ایسی ہی پچاس ہتھوڑیاں اور تیار کرو۔"

مرسلہ...... کمیل شوکت، کراچی

○ .... ○ .... ○ .... ○

ایک بچّے کے ابو کی ٹانگ لکڑی کی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کے ابو کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اسے نئی ٹانگ دی جائے۔ خیراتی ہسپتال کے ڈاکٹر نے اسے سائز کے مطابق لکڑی کی ٹانگ دے دی۔ دوسرے ہفتے وہ بچّہ ڈاکٹر کے پاس آیا اور بتایا

کہ اس کے ابو سے وہ ٹانگ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے پھر نئی ٹانگ دے دی تیسرے ہفتے بھی بچے نے یہی ڈرامہ کیا اور نئی ٹانگ لے گیا جب چوتھی بار وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا "تم اپنے ابو کے لئے چوتھی ٹانگ لے جا رہے ہو، وہ کرتے کیا ہیں؟"

"وہ!" بچے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ڈائننگ ٹیبل بنا رہے ہیں۔"

مرسلہ..... عبدالعظیم، کورنگی کراچی

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

بس مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی لیکن مزید سواریوں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ ایک شخص کے پیچھے موٹی سی توند والا ایک بہت موٹا آدمی کھڑا تھا۔ جب وہ سانس لیتا تو اس کا موٹا سا پیٹ بار بار اس شخص کی پیٹھ سے ٹکراتا۔ وہ بے چارہ بہت ڈسٹرب ہو رہا تھا آخر اس نے مڑ کر موٹے آدمی سے کہہ ہی دیا۔

"جناب آپ مجھے دھکے کیوں دے رہے ہیں؟"

"میں تو سانس لے رہا ہوں۔" موٹا گھبرا کر بولا۔

"یہی سانس اگر بس کے پیچھے کھڑے ہو کر لیں تو کتنوں کا بھلا ہو جائے؟"

"وہ کیسے؟"

"آپ کی سانسوں سے بس چل جو پڑے گی"

ان صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

مرسلہ..... شبیر احمد، کراچی

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

مشہور سائنس دان سر آئزک نیوٹن ایک دن آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اس طرح

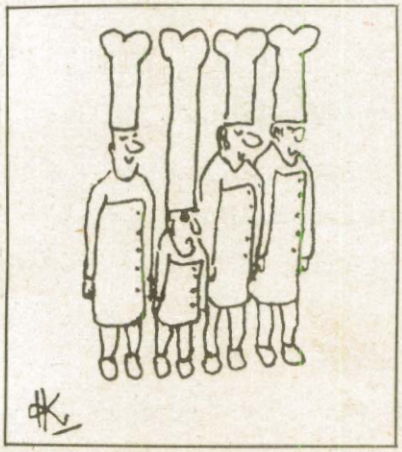

کیے جاؤ کوشش مرے دوستو!

دیکھ کر قصبے کے دو آدمی آپس میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔

ایک نے کہا، "نیوٹن آسمان پر کوئی نیا ستارہ تلاش کر رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا، "نہیں بلکہ وہ کوئی نیا سیارہ دیکھ رہا ہے۔"

دونوں آدمیوں کے درمیان بحث بڑھ گئی تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ نیوٹن سے چل کر پوچھ لیتے ہیں کہ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے کیا دیکھ رہا ہے؟

چنانچہ ان میں سے ایک نے جب نیوٹن سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو نیوٹن ہولے سے مسکرایا اور پھر اپنی مسکراہٹ کے دوران کہا، "اس وقت میری چھینک رُک رہی ہے اور چونکہ مجھے آسمان کی جانب دیکھنے سے آسانی سے چھینک آجاتی ہے اس لئے میں آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔"

مرسلہ...... عبدالعظیم، کراچی۔

○ .... ○ .... ○ .... ○

ننھا بچہ (سائنس دان سے) "انکل! میں کل بازار سے صابن کی ٹکیا لایا تھا۔ اس سے اپنی شرٹ دھوئی تو وہ سکڑ کر چھوٹی ہوگئی۔ بتایئے میں کیا کروں؟"

سائنس دان (سوچتے ہوئے) "ایسا کرو۔ تم بھی اسی صابن سے نہالو۔"

مرسلہ...... شکیل ابرار، بہادر آباد کراچی۔

○ .... ○ .... ○ .... ○

تجربات میں ہمہ وقت مصروف رہنے والے دو سائنس دان ایک روز فارغ ہوئے تو آپس میں گپ شپ لڑانے لگے۔ باتوں کے دوران ایک نے دوسرے سے پوچھا:

"ذرا یہ تو بتاؤ مچھر اور ہاتھی میں کیا فرق ہے؟"

"مچھر ہاتھی کے کاٹ سکتا ہے مگر ہاتھی مچھر کے نہیں کاٹ سکتا۔"

دوسرے سائنس دان نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ...... عاصم، کراچی۔

○ .... ○ .... ○ .... ○

پہلا دوست (دوسرے سے) "تمہارے ابو کہاں گئے ہیں؟"

دوسرا دوست ...... "ہسپتال۔"

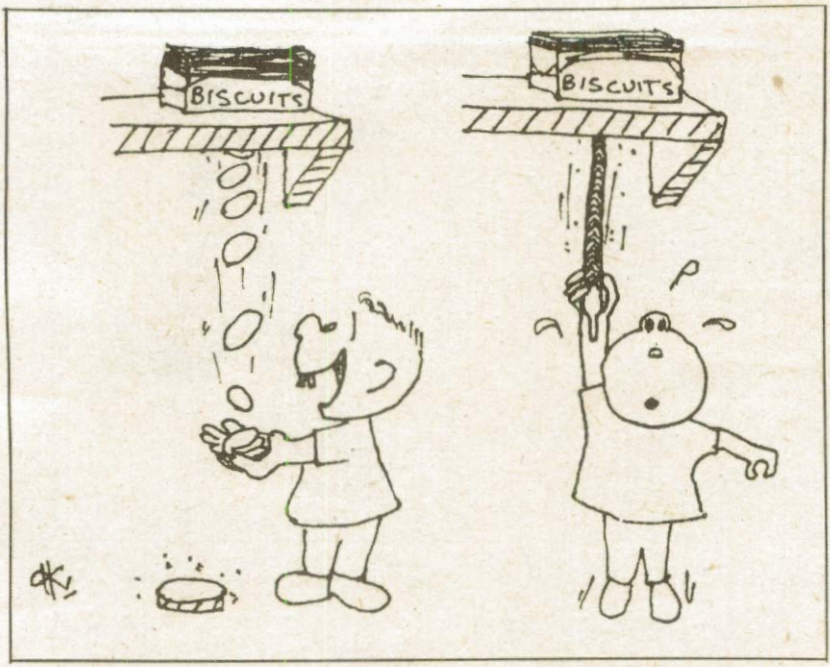

پہلا دوست ..... مجھے سن کر دُکھ ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہیں۔ کیوں خیر تو ہے؟"

دوسرا دوست ..... "خیر سے میرے ابو ڈاکٹر ہیں۔"

مرسلہ ..... اطہر اقبال صدیقی، کراچی۔

○○

یاسر اور عرفان آپس میں باتیں کر رہے تھے یاسر نے کہا "میرے ابو نے ایک ایسا ایئر کنڈیشنر ایجاد کیا ہے جس کو اگر گھر میں چلا دیا جائے تو گھر میں برف جم جاتی ہے۔"

عرفان: "اور میرے ابو نے ایک ایسا پنکھا ایجاد کیا ہے کہ جس کو اگر گھر میں چلا دیا جائے تو آندھی آجاتی ہے۔"

یاسر: "ایسا تو نہیں ہو سکتا!!!"

عرفان: "اگر تم برف پگھلاؤ تو میں آندھی بند کر دوں گا۔"

مرسلہ ..... چوہدری افتخار احمد خضر، جھنگ

○○

ایک تاجر اپنے کارکنوں کو کچھ اس طرح جھڑک رہا تھا۔ "تم لوگوں میں تو ذرا بھی خوفِ خدا باقی نہیں۔ غضب خدا کا۔ اعلیٰ درجے کی اینٹوں کو چھوڑ کر تم گھٹیا اینٹیں ملاتے ہو، مرچوں میں!"

مرسلہ ..... غلام مرتضیٰ علوی، ٹوبہ ٹیک سنگھ

کوئی بتا دے کوئی بتا دے

فہیم الحق قریشی

کوّے کا کیوں رنگ ہے کالا　　مکڑی کیوں بُنتی ہے جالا
پہلے چابی بنی یا تالا　　کوئی بتا دے کوئی بتا دے
شیر تو ہے جنگل کا راجہ　　چوہے ہیں بلّی کا کھاجا
پھر کیوں بلّی شیر کی خالہ　　کوئی بتا دے کوئی بتا دے
ہاتھی تو ہے ایک چٹان　　چیونٹی ہے ننھی سی جان
مار کیسے ہاتھی کو ڈالا　　کوئی بتا دے کوئی بتا دے
لاکھوں من کا پانی بھاری　　اور کیسے یہ ژالہ باری؟
بادل جب ہے روئی کا گالا　　کوئی بتا دے کوئی بتا دے
ٹوٹ گئے کیوں سارے سپنے　　کیوں آئے کم نمبر اپنے
سبق تو تھا سب دیکھا بھالا　　کوئی بتا دے کوئی بتا دے

ایجادات نمبر
ایک شاندار قومی خدمت ہے

مُلک کے ممتاز سائنس دانوں کے تاثرات

آنکھ مچولی کا "ایجادات نمبر" میں نے دیکھا۔ بلاشبہ یہ اپنے موضوع پر نہایت معلوماتی اور دلچسپ مواد سے مزین ہے۔ اس بات کی ضرورت بہت عرصے سے ہے اور میں مختلف مواقع پر اس پر زور دیتا رہا ہوں کہ سائنسی علوم کو قومی زبان میں منتقل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جو کام حکومتوں اور تعلیمی اداروں کے کرنے کے ہیں، وہ فریضہ آنکھ مچولی نے اپنی سطح پر ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اتنا وقت نہیں ملتا اور نہ ہی میری عمر ایسی ہے کہ میں بچوں کے رسائل باقاعدگی سے پڑھوں۔ لیکن اس رسالے کو دیکھ کر میرا جی خوش ہو گیا اور دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ خدا ان لوگوں کو حوصلہ دے اور ان کے ذوق و شوق کو باقی رکھے۔ واقعی یہ قوم کی بے بہا خدمت کر رہے ہیں۔ میں ادارہ آنکھ مچولی کو "ایجادات نمبر" کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی)

عصرِ حاضر تبدیلیوں، ایجادات اور ترقی سے عبارت ہے۔ اقوامِ مغرب کی موجودہ ترقی اور خوش حالی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہی مرہونِ منّت ہے۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اکیسویں صدی میں صرف وہی اقوام عزت و سرفرازی کے ساتھ زندہ رہ سکیں گی جن کی زمامِ کار روشن خیال، ترقی پسند، تعلیم یافتہ اور ہنر مند لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ دس کروڑ انسانوں کا ملک وطن عزیز پاکستان بھی کامرانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخلے کا منتظر اور مستحق ہے۔ ماضی کی کوتاہیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہمیں اپنے موجودہ طرزِ عمل پر غور کرنا ہو گا۔ میرا ادراک یہی کہتا ہے کہ اس کے لئے ہمیں نونہالان وطن کی فکری، تعلیمی اور جسمانی نشوونما پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ کیونکہ کل کی زمامِ کار آج کے بچوں کو ہی سنبھالنی ہے۔ یہ وقت کی ضرورت ہی نہیں، پوری قوم کی بقا کا تقاضہ ہے۔

ہر وہ شعوری کوشش جو نئی نسل کی بہتر تربیت کے ضمن میں ہو تعریف اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ رسالہ "آنکھ مچولی" کا "ایجادات نمبر" بھی ایسی ہی ایک کوشش ہے۔ خوب صورت سرورق اور طباعت اور اس سے کہیں زیادہ خوب صورت مضامین۔ "آنکھ مچولی" دل، نظر اور ذہن سب کے لئے ایک عمدہ اور صحت مند تفریح مہیا کرتا ہے۔ جنوری ۱۹۹۳ کا شمارہ "ایجادات نمبر" خصوصی اہمیت کا حامل تھا اور یہ شمارہ میری ذاتی لائبریری میں جگہ بنا چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس خلوص دل سے کی ہوئی کاوش نے دوسروں کو بھی یقیناً متاثر کیا ہو گا۔

بحیثیت سائنس دان میں چیزوں کو حقیقی اور کھرے پس منظر میں دیکھنے کا عادی ہوں۔ جستجو، مشاہدہ اور تجزیہ سائنس کے بنیادی عوامل ہیں اور زیادہ تر ایجادات انہیں کی مرہونِ منّت ہیں۔ اتفاقی دریافتیں اور ایجادات بھی دراصل کسی دوسری شے کی جستجو کے درمیان میں سامنے آجاتی ہیں۔ ہر ایجاد جستجو اور تخیل پر ہوتی ہے۔ مشہور فکشن نگار اور مفکر ژول ورن کی پیش گوئیاں بنی نوعِ انسان کے دماغ کو نئی سوچ بخشتی ہیں۔ اس نے ایک صدی قبل جن ایجادات کا تذکرہ کیا وہ آج حقیقت بن چکی ہیں۔ مسلمانوں کی اپنی تاریخ سائنسی کارناموں اور نت نئی ایجادات سے بھری پڑی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی نے بڑے خوب صورت انداز میں مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ جابر بن حیان، عظیم

مسلم کیمیادان کو تجرباتی کیمیا کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ اس عظیم کیمیا دان کے ذکر سے مزید کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ایڈیسن ایک عظیم موجد تھا۔ خان اکبر علی نے ایڈیسن کے حالات زندگی پر مختصر مگر خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ غرض یہ شمارہ ایسے ہی کئی دلچسپ اور ذہن کو جلا بخشنے والے مضامین کا خوب صورت گلدستہ ہے۔

مدیر اعلیٰ ظفر محمود شیخ اور ان کی ٹیم دلی مبارک باد کی مستحق ہے۔ میری خواہش ہے کہ ایسی کاوشیں جاری رہیں اور قومی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی نونہالان وطن کے لئے ایسے رسالے شائع ہوتے رہیں تاکہ یہ عظیم ملک آئندہ صدی میں عزت و وقار کے ساتھ داخل ہو سکے اور اس کی زمام کار صحت مند، ذہین اور سچے پاکستانی نوجوانوں کے ہاتھ میں ہو۔

والسلام، اللہ حافظ

عطاالرحمان

پروفیسر عطاالرحمٰن۔ تمغۂ امتیاز۔ ستارۂ امتیاز

ڈائریکٹر

حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری

جامعہ کراچی۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کا خصوصی شمارہ "ایجادات نمبر" نظر سے گزرا۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ بچوں کے لئے یہ رسالہ اس طرح کے خصوصی نمبر نکالتا ہے۔ سائنسی سمجھ بوجھ اور کلچر سے آگاہی اگر بچوں کی ذہنی نشوونما کے ساتھ پرورش پائے تو ہم آئندہ نسلوں میں سائنس کے عروج کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اس خصوصی جریدے میں مختلف مضامین سائنس کے حوالے سے جس سلیس زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے لئے مصنفین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

عام طور پر جب سائنس کی گفتگو ہوتی ہے تو ہم اپنے ماضی کے کارہائے نمایاں کی گفتگو کرتے ہیں۔ اس شمارے میں خاص طور پر نوری نستعلیق، اور پاکستان کی پہلی الیکٹرک کار، حال کی ترقی کی ضامن ہیں اور اس سے بچوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آج کے اس زمانے میں بھی ہم دوسرے ممالک کے قدم بہ قدم چل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی کا مضمون "مسلمان سائنس دانوں کی چند ایجادات" ایک اچھا تحقیقی مضمون ہے۔ اور اس امر کا متقاضی ہے کہ

آئندہ آنے والے شماروں میں سائنس دانوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ بچّوں کے لئے جو کہانیاں اور نظمیں اس شمارے میں ہیں، ان کی بنیاد ہی سائنس پر ہے جس سے بچوں کے ذہنوں میں مثبت اور دیرپا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس طرح بچوں میں سائنسی شعور پیدا ہو گا اور سائنس کو ایک خشک تدریسی کتابوں کا حصہ سمجھنے کے بجائے اس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

مدیر مجلسِ ادارت اور صاحب مضمون کی یہ کاوش قابلِ ستائش ہے۔ اور امید ہے کہ آئندہ بھی آنکھ مچولی کے شمارے سائنس کے لئے مختص کئے جائیں گے۔

پروفیسر ظفر حسنین زیدی

۱۰۰ اسکول بیگ کا تحفہ

دسمبر کے شمارے میں ہم نے آنکھ مچولی کے ساتھیوں کو سو اسکول بیگ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت سے کوپن موصول ہوئے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے جن سو ساتھیوں کے نام نکلے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ ان کے بیگ، ان کو حلیہ ہی روانہ کر دیئے جائیں گے۔ (ادارہ)

فیصل احمد صدیقی، کراچی۔ سنبل مظفر، راولپنڈی۔ محمد ثاقب خان، کراچی۔ اسماء قریشی، لاہور۔ محمد رضاء الحق، باغ آزاد کشمیر۔ عفت النساء کراچی۔ محمد نعیم امین، کراچی۔ تابندہ اکرم، حیدر آباد۔ اویس شاہد، کراچی۔ ثمین زہرا، کراچی۔ حمید نعیم، کراچی۔ محمد وسیم افضل، لاہور۔ ذیشان طاہر لون، جہلم۔ محمد عابد آفریدی، کوہاٹ۔ حسان انجم، پشاور۔ نور حسین، میرپور خاص۔ ناصر ندیم، کراچی۔ جمیع عماد الدین احمد، کراچی۔ امیر علی، ٹنڈو الہ یار۔ انیقہ نصیر چوہدری، میرپور۔ سمین افشاں، کراچی۔ عامر اقبال، نوشہرہ۔ عمران جمیل، کراچی۔ مہوش نورین شامی، ملتان۔ عظیم حفیظ، اسلام آباد۔ محمد ذیشان، سرے گھاٹ۔ عثمان علی، بلورے والا۔ نسیم شہزادی، راولپنڈی۔ ارم بشیر، راولپنڈی اسماء، حیدر آباد۔ کرن، لاہور۔ جویریہ حفیظ، گوجرہ۔ شاہد حسین، شکارپور۔ رفعت رعنا، کراچی۔ محمد فاروق، کراچی۔ ندیم اقبال ساقی، جہلم۔ خرم خان، لاہور۔ مرزا عنصر جاوید، کراچی۔ سید عطاء علی، حیدر آباد۔ ناہید رخشندہ، ہری پور۔ اشتیاق الرحمٰن شاہد، راولپنڈی۔ زوہیر امیر، سیالکوٹ۔ سید محمد دانش، کراچی۔ منور جہاں، کراچی۔ شاہ فیصل خان، کراچی۔ سمین فاطمہ، کراچی۔ ناصر خان، ملتان۔ تہمینہ قدیر، کراچی۔ محمد اکرام، لاہور۔ فرحان الزماں خاں، کراچی۔ محمد علی رضا، سرگودھا۔ شازیہ کوثر، میرپور۔ محمد ارشاد، حیدر آباد۔ دہنی بخش، جنگ شاہی۔ سونیا رحمان، کوہاٹ۔ محمد عالم کھوسہ، بلوچ، ڈیرہ اللہ یار۔ عبدالنعیم، کہوڑ لکپا۔ عامر ممتاز نوید، سیالکوٹ۔ خواجہ ظفر احمد، اسکردو۔ تنویر احمد، کراچی۔ ثمرہ، کراچی۔ سبطین خان، پشاور۔ ثروت ضیاء، اسلام آباد۔ عمار جاوید، لاہور۔ عشرت بانو، کراچی۔ عظمیٰ ظفر، ہنوں۔ کاشان احسن، پشاور۔ حسن رضا، لاہور۔ عثمان علی طاہر، قصور۔ نازش فیاض، پشاور۔ ثنا خان، اسلام آباد شہنیلا، کراچی۔ میمونہ بانو، لاہور۔ عاطف، کراچی۔ ثمر الدین، کراچی۔ عرفان حیدر، پشاور۔ اسد رضا، ملتان۔ محترم علی، سکھر۔ سعود غلام نبی، راولپنڈی۔ تنویر احمد ننھا، گجرات۔ شاہ رخ حیات خان، لاہور۔ نازیہ، کراچی۔ خالد محبوب، کراچی۔ شفقت خالد، مظفر گڑھ۔ آصف رضا، ڈنگہ۔ رحمٰن علی صدیقی، کوٹری۔ ملک فاطمہ نور، کراچی۔ زبیر ارشد، سرگودھا۔ عائشہ ریاض، کراچی۔ یاسر فاروق، کراچی۔ ثاقب عزیز، پشاور۔ صائمہ، ٹنڈو الہ یار۔ فاطمہ خانم، کوئٹہ۔ عطیہ فردوس، سرگودھا۔ کاشف علی اکبر، راولپنڈی۔ مجاہد حسین، کراچی۔ محمد رفیق، کراچی۔ رضیہ، لاہور۔ اویس، اسلام آباد۔ حبیب رؤف، لاہور۔

تھائی لینڈ کی ایک لوک داستان سے ماخوذ

سونا بنانے کا گر

عابد سلطان

پرانے زمانے کی بات ہے کہ تھائی لینڈ کے ایک دور دراز گاؤں میں نائے ہا تھانگ نامی شخص رہتا تھا۔ نائے ہا حد درجہ کاہل اور بے کار آدمی تھا۔ وہ نہ اپنی بیوی بچوں اور گھر کے مسائل کی طرف توجہ دیتا اور نہ ہی اپنی زمینوں اور باغوں کی دیکھ بھال کرتا۔ اسے تو بس ایک ہی دھن لگی ہوئی تھی، "سونا بنانے کا گر"۔ سونا بنانے کا بھوت اس کے سر پر ایسا سوار ہوا تھا کہ باقی کسی کام کی طرف وہ دھیان

ہی نہیں دیتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی عرصے میں کنگال ہو گیا۔ بڑے دنوں کے لئے جو تھوڑا بہت بیوی نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا وہ بھی آخر کب تک چلتا؟ گھر میں چولہا جلنا مشکل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ نوبت فاقوں تک پہنچتی، اس کی بیوی اپنے باپ کے گھر گئی اور سارا حال بیان کیا۔ اس کا باپ ایک عقل مند اور تجربہ کار آدمی تھا۔ تحمل سے ساری رُوداد سننے کے بعد سوچ میں پڑ گیا۔ آخر کار اپنی بیٹی کو تسلی دے کر کہا کہ تم واپس گھر جاؤ۔ میں نائے ہا کو سمجھا دوں گا۔ جب تک تمہارے گھر کے حالات نہیں سنور جاتے تب تک میں تمہاری مدد کروں گا۔ نائے ہا کی بیوی مطمئن ہو کر اپنے گھر چلی آئی۔

دوسرے دن نائے ہا کے سسر نے اسے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی جسے نائے ہا نے بخوشی قبول کر لیا۔ پر تکلف کھانے کے بعد جب وہ دونوں آتش دان کے پاس بیٹھ کر سبز چائے کی چسکیاں لے رہے تھے تو نائے ہا کے سسر نے رازدارانہ لہجے میں کہا "نائے ہا، مجھے علم ہے کہ تمہیں سونا کتنا پسند ہے۔ دراصل مجھے سونا بنانے کا ایک گُر معلوم ہو گیا ہے۔ باقی سب چیزیں تو میں اکٹھی کر چکا ہوں۔ بس ایک چیز اگر مل جائے تو پھر سمجھو کہ ہم سونا بنانے کے کارخانے کے مالک ہو جائیں گے۔ کیا تم وہ چیز حاصل کر سکو گے؟"

نائے ہا اپنے سسر کی بات سن کر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور بہت اشتیاق سے پوچھا، "جناب، جلدی بتائیں وہ چیز کیا ہے؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ چاہے کچھ بھی ہو میں اسے حاصل کرنے کے لئے دن رات ایک کر دوں گا۔"

نائے ہا کے سسر نے مسکراتے ہوئے کہا، "تو پھر سنو! کیلے کے درخت کے پتوں کے نچلے حصے والے باریک سفید ریشوں کا پاؤڈر اگر تین کلو گرام ہی مل جائے تو کام بن جائے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ سفوف تمہارے اپنے باغ کے درختوں کے پتوں کا ہو۔"

اگلے روز، صبح سویرے نائے ہا اپنے کیلے کے باغ کی طرف چلا۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت افسردہ ہوا کہ اس کی بے توجہی اور کاہلی کی وجہ سے سبھی درخت سوکھ کر گر چکے ہیں۔ لیکن اس کے سر میں سونا بنانے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے باغ کے سُوکھے درخت کٹوا کر نئے سرے سے اعلیٰ قسم کے کیلے کے درخت لگوائے اور پھر دن رات انکی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے لگا۔ وہ اپنے باغ میں اتنی محنت کرتا کہ گاؤں کے دوسرے کسان اور زمیندار سب حیران تھے۔ آخر کار اس کی محنت رنگ لائی اور درختوں میں پھل لگنا شروع ہوئے۔ اب ان کے پکنے کا انتظار تھا۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب نائے ہا بہت جوش و خروش اور تندہی سے درختوں کے پتوں کی نچلی سطح والے ریشوں کا سفید پاؤڈر جمع کرنے میں مصروف تھا۔ اسے درختوں پر اُگے ہوئے کیلوں کے گچھوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس بات سے بھی

بے خبر تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹے درختوں سے پکے ہوئے کیلوں کے بھاری گچھے اتار رہے ہیں۔ اس کے دماغ پر تو بس سونے کا خبط سوار تھا۔ چنانچہ کئی روز کی محنت کے بعد جب وہ تین کلو گرام سفید سفوف کیلے کے درخت کے پتوں کا، اپنے عقل مند سسر کے پاس لے کر گیا اور سونا بنانے کا گُر بتانے کا مطالبہ کیا تو اس کے سسر نے مسکراتے ہوئے کہا، "لیکن نائے ہا، اب تو تم خود ڈھیر سارے سونے کے مالک بن چکے ہو۔ جاؤ، اپنے گھر جاؤ۔ تمہاری محنت کا پھل، سونے کے سکّے تمہارے گھر میں موجود ہیں۔"

نائے ہا بھاگم بھاگ گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی اور بچے گھر کے بڑے کمرے میں اس کے منتظر ہیں اور میز سونے کے بے شمار سکّوں سے بھری ہوئی ہے۔ نائے ہا جتنا خوش تھا اتنا ہی اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ پوچھا، "یہ اتنے ڈھیر سارے سونے کے سکّے تمہیں کیسے ملے؟"

"یہ سب تمہاری محنت کا پھل ہے۔ اپنے باغ کے پھل فروخت کر کے یہ سکّے ملے ہیں۔ اگر خدا نے چاہا تو ہر سال اتنے سارے سونے کے سکّے ملتے رہیں گے۔" اس کی بیوی نے مسرور لہجے میں جواب دیا۔

تب نائے ہا تھانگ کو احساس ہوا کہ اس کے دانا سسر نے اسے "محنت میں برکت ہے" کا سبق کتنے مؤثر انداز میں سکھایا ہے۔ اس نے اپنے دل میں پختہ عزم کیا کہ آئندہ نہ تو میں اپنے بیوی بچوں اور گھر کے مسائل سے بے توجہی برتوں گا اور نہ ہی اپنے باغ میں محنت سے جی چُراؤں گا۔

پانچ چیزیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے پیارے نبی محمدؐ سے کہ میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ انھیں دوسری چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۱۔ میں نے اپنی رضا کو مخالفتِ نفس میں رکھ دیا ہے لوگ اسے موافقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۲۔ میں نے راحت و آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۳۔ میں نے علم و حکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۴۔ میں نے اطمینان و سکون کو قناعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دولت میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

۵۔ میں نے عزت کو اپنی عبادت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے بڑے مرتبوں میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

(مرسلہ..... رضوان احمد، اسلام آباد)

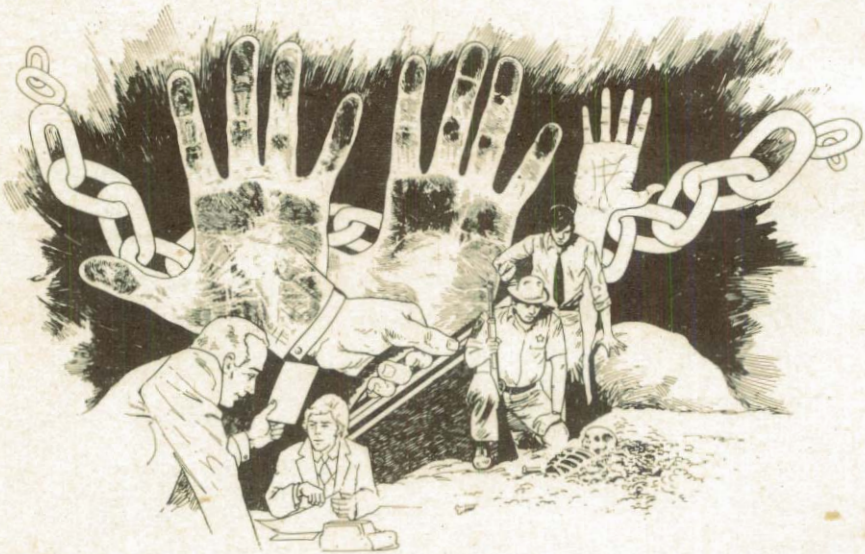

جب ہاتھ بولنے لگے

سلمان غزالی

یہ بات ہے بیتی ہوئی اٹھارہ صدیوں اور انیسویں صدی کی ابتدائی سات دہائیوں کی، جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں جرائم کی شرح میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور تمام ممالک کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لئے ان جرائم کی روک تھام اور مجرم کو پکڑنے کا مرحلہ مشکل سے مشکل ہوتا جارہا تھا۔ یوں تو وقت کے ریکارڈ میں جرم اور قتل کا اندراج ہابیل اور قابیل کے تنازعہ سے ہی ہو گیا تھا مگر وہ ابتدائے زندگی تھی اور دور جاہلیت تھا۔ مگر پچھلی انیس صدیوں میں جوں جوں انسان ترقی کی منازل طے کرتا گیا اس کی علمی بصیرت اور عقلی وسعت بڑھتی گئی اور تہذیب و تمدن میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آئی تو جاہلیت کے اندھیرے سے نکل کر علم اور تہذیب کی روشنی پانے کے بعد جہاں جرائم اور قتل و غارت گری میں کمی آنی چاہئے تھی وہاں اس کی شرح میں

بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔

انیسویں صدی میں ایک مجرم ایک جگہ واردات کرتا ہے، قتل کرتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ پولیس جائے واردات پر پہنچتی ہے۔ جائزہ لیتی اور کوئی ایسا سراغ نہیں پاتی کہ مجرم کو پکڑ سکے یا پھر کئی دفعہ وہ مجرم کو جانتے ہیں مگر کوئی ایسا ثبوت نہیں رکھتے کہ اسے پکڑ سکیں اور یوں مجرم کھلے عام دندناتا پھرتا ہے۔ ایسے میں تمام دنیا کے قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک ایسے سسٹم کی شدّت سے ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جس کے تحت مجرم کو آسانی سے پکڑا جا سکے اور جو ایسا ثبوت مہیا کر سکے جسے دنیا کا کوئی قانون چیلنج نہ کر سکے اور یوں مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔

ایسے میں ۱۸۷۷ء میں ایک انگریز سائنس دان "سر ولیم جے ہارشیل" نے "فنگر پرنٹس سسٹم" یعنی انگلیوں کے نشانات سے فرد کی پہچان سے، جسے "ڈیکٹائلو گرافی" Dactylo graphy کہا جاتا ہے، دنیا کو متعارف کروایا۔ جس کے بعد اس شعبے میں تحقیقات کا دور شروع ہوا اور یوں ۱۸۹۲ء میں انگلیوں کے نشانات کے علم کو باقاعدہ "فنگر پرنٹ سسٹم" کے طور پر رائج کر دیا گیا، اور اس کا سہرا ایک برطانوی "انتھرو پالو جسٹ" Anthro pologist "سر فرانسس گالٹن" کے سر ہے جن کے نام پر فنگر پرنٹ سسٹم کو "گالٹن سسٹم" کا نام دیا گیا اور یوں مجرموں کی شناخت اور ان کے خلاف مستند ثبوت مہیا کرنے کا ایک مؤثر اور کارگر ذریعہ قانون کو میسّر آیا۔

ماہرین کے مطابق ہر انسان کے ہاتھوں کی انگلیوں کا مخصوص پرنٹ ہوتا ہے جو کسی بھی دوسرے شخص سے نہیں ملتا۔ ہر شخص کو انگلیوں کے پوروں پر مختلف Ridges اور grooves ہوتے ہیں جو ایک مخصوص پیٹرن بنا لیتے ہیں۔ بنیادی طور پر ماہرین نے چار طرح کے پیٹرن بیان کئے ہیں پہلا Arch کی شکل کا، دوسرا Loop کی طرح، تیسرا Whorls کی مانند اور چوتھا Compound یعنی جس میں ایک سے زیادہ پیٹرن مشترکہ ہوں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۶۷ فیصد لوگوں میں Loops پیٹرن، ۲۵ فیصد میں Whorls پیٹرن ۷-۶ فیصد میں Arch پیٹرن اور ۲ فیصد میں Compound پیٹرن موجود ہے۔ ہر شخص کے فنگر پرنٹس پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں اور یہ تمام عمر نہیں بدلتے اور نہ ہی کسی طریقے سے تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا طریقہ بھی بہت آسان ہے۔ عام حالات میں انگلی کو سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر فنگر پرنٹس اتارے جا سکتے ہیں۔ جبکہ جائے واردات سے فنگر پرنٹس حاصل کرنے ہوں تو متوقع جگہیں جہاں مجرم کے فنگر پرنٹس مل سکتے ہوں مثلاً دروازے کا ہینڈل، فرنیچر، استعمال شدہ چیزیں، آلہ قتل وغیرہ ان پر ایک مخصوص کیمیکل چھڑک دیا جاتا ہے جس پر تھوڑی دیر میں فنگر پرنٹس ابھر آتے ہیں، جنہیں پھر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

ہر ملک کی پولیس اپنے علاقے کے مجرمان کے فنگر پرنٹس کا ریکارڈ اپنے پاس رکھتی ہے اور جو شخص ایک دفعہ بھی کسی جرم میں ملوث پایا جائے اس کے فنگر پرنٹس محفوظ کر لئے جاتے ہیں اس طرح کسی بھی جائے واردات سے حاصل کئے گئے فنگر پرنٹس کو ریکارڈ میں موجود فنگر پرنٹس کے ساتھ ملا کر یا مشتبہ شخص کے فنگر پرنٹس کے ساتھ موازنہ کر کے مجرم کی شناخت کی جاتی ہے۔ پھر اس سسٹم کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ فنگر پرنٹس کو ٹرانس میٹر کوڈ کے ذریعے دنیا کے کسی بھی حصے میں فوراً منتقل کیا جا سکتا ہے اور مجرم چاہے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگ جائے اس کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ ایسے کئی بہت سے مشہور کیس ہیں جن میں مجرم بہت بڑے پیمانے پر تخریب کاری یا ملک و قوم کو نقصان پہنچانے کے بعد فرار ہو کر کسی دوسرے ملک میں جا کر سٹیل ہو گیا اور وہاں اپنا حلیہ بدل کر نئی شناخت اور شخصیت کے ساتھ رہنے لگا مگر شک کی بنیاد پر فنگر پرنٹس چیک ہونے پر پکڑا گیا۔

اس سسٹم کے کارگر ہونے کے بعد جو سب سے اہم نکتہ اٹھا وہ یہ تھا کہ اربوں کھربوں کی آبادی میں ایک سے زیادہ انسانوں کے ایک جیسے فنگر پرنٹس بھی تو ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نکتے پر تحقیقات شروع ہوئیں۔ مختلف ملکوں سے فنگر پرنٹس کے ریکارڈز دوسرے ممالک بھیجے گئے۔ مکمل سروے اور چیک اپ کیا گیا اور بالآخر یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ تمام دنیا کے کرائم ریکارڈز میں کسی بھی دو انسانوں کے فنگر پرنٹس ایک جیسے نہیں حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں بچوں کے فنگر پرنٹس بھی بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جب اس ضمن میں ریسرچ کی گئی کہ کتنے لوگوں میں یہ امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک جیسے فنگر پرنٹس والے دو افراد مل جائیں تو ایک دفعہ ایک انتہائی حیرت انگیز جواب سامنے آیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق "چونسٹھ ہزار ملین" لوگوں میں یہ امکان ہو سکتا ہے کہ ان میں سے دو افراد کے فنگر پرنٹس آپس میں مکمل طور پر مل جائیں۔ اور یہ تعداد دنیا کی موجودہ آبادی سے تیس گنا زیادہ ہے۔ یہاں پر آ کر انسان خدا کی قدرت دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور اس کے پاس اس چیز کا کوئی جواب نہیں کہ اتنی معمولی لکیروں کے کھیل میں اتنا فرق کیونکر ممکن ہے۔

مجرموں کی شناخت کے علاوہ اور بھی بہت سے شعبوں میں فنگر پرنٹس کا علم مدد گار ثابت ہوا ہے۔ مثلاً کسی گمشدہ انسان کی تلاش میں یا کسی ایسے شخص کو شناخت میں جو اپنی یادداشت کھو چکا ہو یا کسی اور لاوارث انسان یا لاش کی شناخت کے لئے۔ اور کئی دفعہ بہروپیوں کو بے نقاب کرنے کے لئے بھی بہت مدد گار ثابت ہوا ہے۔

ایک بہت دلچسپ اور مشہور کیس اٹلی کے ایک فوجی آفیسر کا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اٹلی کے شہر میلان سے ایک فوجی افسر پروفیسر کینیلا پر اسرار طور غائب ہو گیا۔ سات سال تک کچھ پتہ نہیں چل

سکا۔ سات سال بعد ایک شخص کو ہسپتال میں داخل کیا گیا جو اپنی یاداشت کھو چکا تھا۔ اس شخص کا حلیہ اور شکل بالکل پروفیسر جیسی تھی مگر وہاں پر کوئی پروفیسر کو نہیں پہچانتا تھا۔ دو سال بعد پروفیسر کی بیوی اور بیٹی نے ہسپتال میں اس مریض کو پروفیسر کے طور پر شناخت کر لیا۔ اس کا خصوصی علاج کیا گیا اور جلد ہی وہ شخص صحت یاب ہو گیا اور ٹھیک ہونے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ ہی پروفیسر کینیلا ہے مگر کچھ ہی عرصے کے بعد ایک عورت "مسز برونیزا" نے اس پروفیسر کو دیکھا تو شور مچا دیا کہ یہ تو میرا شوہر ہے "مسٹر برونیزا" جو تین سال پہلے مختلف جرائم میں ملوث رہنے کے بعد غائب ہو گیا تھا اور مفرور تھا۔ چنانچہ اس شخص کا مکمل چیک اپ کیا گیا اور حیرت انگیز طور پر نہ صرف پروفیسر اور مسٹر برونیزا کی شکل اور حلیہ ملتے تھے بلکہ اس شخص کے جسم پر کئی نشان اسے پائے گئے جو پروفیسر اور برونیزا دونوں کے جسموں پر موجود تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ شخص دراصل پروفیسر ہے یا برونیزا۔ آخر کار پولیس نے ریکارڈ سے برونیزا کے فنگر پرنٹس نکلوائے اور ان کے موازنہ اس شخص کے فنگر پرنٹس کے ساتھ کیا تو وہ دونوں مختلف نکلے اور یوں یہ مسئلہ حل ہوا۔

اس طرح قدرت کے بنائے ہوئے اس چھوٹے سے نظام کے تحت انسان اپنی تمام تر چالاکی کے باوجود اپنی ہی لکیروں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔

●●●

کام کی باتیں

۱..... اگر تم ہنستے ہو تو تمام دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی اگر تم روتے ہو تو اکیلے ہی روؤ گے۔

۲..... علم سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی دور ہو جاتی ہے۔

۳..... دس میں نو حصہ برائیاں اور تکالیف صرف سستی سے پیدا ہوتی ہے۔

۴..... کامیابی صرف ایک دفعہ آکر دروازہ کھٹکھٹاتی ہے مگر مصیبت دن رات میں کئی وقت تم پر حملہ کر سکتی ہے۔

۵..... اس شخص سے بچو جو اپنی برائیاں لوگوں میں بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

۶..... بیکار لوگوں کے دلوں میں شیطان فوراً کارخانہ کھول دیتا ہے۔

۷..... بزدل انسان موت آنے سے پہلے ہی کئی مرتبہ مر چکتا ہے لیکن بہادر آدمی صرف ایک بار مرتا ہے۔

۸..... لکڑیاں ایک ایک جلاؤ تو دھواں دیتی ہیں اکٹھی جلاؤ تو روشنی پیدا ہوتی ہے۔

۹..... لوہے کا کلہاڑا لکڑی کے جنگل سے ایک چھاکا تک نہیں اتار سکتا جب تک اس کے ساتھ خود لکڑی کا دستہ شامل نہ ہو یعنی اپنے ہم جنس سے نقصان پہنچتا ہے۔

۱۰..... دشمن اگر دوست بھی بن جائے تو اس پر بھروسہ مت کرو کیونکہ پانی کو چاہے کتنا ہی گرم کیوں نہ کیا جائے وہ آگ بجھانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

جو دے اس کا ہی بھلا

سیما صدیقی

ہمارے علاقے کا سب سے سینئر فقیر چہرے مُہرے سے خاصا معزز دکھائی دیتا تھا۔ بیچارا اندھا تھا ساتھ میں لاٹھی کے علاوہ ایک بچہ بھی لے کر نکلتا تھا، بظاہر لاٹھی اور اس بچے کے سوا اس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ اس کی صدا ہمیشہ ایک ہی ہوتی "جمعرات کا روز ہے بابا...... غریب محتاج کی مدد کرو...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" ہم سوچتے کہ معلوم نہیں بیچارے کے بچوں کے بڑا ہونے میں کونسی رکاوٹیں حائل ہیں جو گذشتہ بیس سال سے یہی صدا لگاتا آرہا ہے۔ ایک روز ہم نے صدا سن کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک بالکل نئے ڈیزائن کا بچہ کھڑا تھا۔ ہم حیران ہوئے کہ بچہ کیسے بدل گیا؟ پہلے آنے والا ٹیڑھی ٹانگوں والا مرچی (سوکھی مرچ) سالڑکا تھا اور یہ پھولے پھولے گالوں والا بھوندو سا بچہ تھا۔ قصہ یہ تھا کہ سینئر فقیر قریباً بیس بائیس سال سے اس پیشے سے منسلک تھا، اس کا مسئلہ یہ تھا کہ جس بچے کو وہ لے کر نکلتا وہ چند سالوں میں بڑا ہوجاتا۔ جس کے بعد وہ اسے الگ دھندے سے لگا دیتا اور خود ایک نئے عزم اور نئے بچے کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھتا۔ وہ بچے ضرور بدلتا تھا مگر اپنا بیان نہیں بدلتا۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ یکے بعد دیگرے آنے والے رنگ برنگے بچے اس کے "ذاتی" تھے یا کسی فرم کو اس نے بچے سپلائی کرنے کا ٹھیکہ دے رکھا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ فقیروں میں "لے پالک" بچوں کا بھی خاصا رواج پایا جاتا ہے۔ (لے پالک بچے سے مراد ہے "بچہ لے کر پالنا" یعنی اگر کوئی لاولد ہو تو وہ کسی صاحب سے ان کا بچہ "گود" لے لے یعنی

(Adopt) کرلے) پیشہ ور فقیر یہ کرتے ہیں کہ گلی محلوں میں گھومتے، اکیلے دُکیلے بچوں کو "گود" لے لیتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس ضمن میں بچے کے والدین سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ آپ کہیں گے کہ ایسے غیر ذمہ دار فقیروں کو پولیس کیوں نہیں پکڑتی تو بات یہ ہے کہ ایسا دھندہ کرنے والے فقیر پولیس والوں کے "لے پالک" ہوتے ہیں۔

معلوم نہیں کیوں آج اس ننھے ڈیزائن کے نمونے کو دیکھ کر ہمارا موڈ سخت آف ہوگیا اور جب اس نے کہا کہ "بی بی! اللہ کے نام پہ..... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں!"

تو ہم نے جل کر کہا "تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟"

فقیر نے سٹپٹا کر بچے کی طرف دیکھا۔ چھوٹے بچے نے باپ کے کالے چشمے کی طرف اشارہ کر کے کہا "بی بی! میرا باپ اندھا ہے..... اللہ کے نام پہ....."

"ہمیں یہ پتہ ہے..... تمہارے نصف درجن بڑے بہن بھائی تم سے پہلے ہمیں یہ بات بتا چکے ہیں اور اتنی بار بتایا ہے کہ ہمیں ہی نہیں تمہارے باپ کو بھی یقین آگیا ہوگا کہ وہ اندھا ہے۔"

یہ تکرار سن کر ہماری بہن بھی باہر آگئی (جس کے دل میں ہمدردی کا سمندر ہمہ وقت لہریں بلکہ ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے) اور روپیہ بچے کے ہاتھ پہ دھر کے بولی "اللہ! کتنا معصوم بچہ ہے..... ہے نا!"

ہمیں تو بالکل خبیث لگ رہا تھا مگر ہم نے کہا نہیں۔

ہفتے کی شام کبھی کبھار ایک ایسا فقیر آتا تھا جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے (کم از کم ہم یہی سمجھتے تھے) کیونکہ وہ لکڑی کے تختے پہ بیٹھا رہتا تھا جس کے نیچے پہیے لگے تھے۔ اس پر وہ گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا، پاؤں پر گدڑی ڈالے رہتا تھا۔ ایک روز ہم لوگ چھت پہ کھڑے ہو کر ہوا کھا رہے تھے۔ کیا دیکھا کہ وہ فقیر گھسٹتا ہوا ہمارے گھر کی طرف آرہا ہے۔ فقیر گیٹ پہ پہنچا اور ہاتھ سے گیٹ دھب دھبانے لگا۔ ہم نے چھوٹی بہن پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ "دیکھو فقیر آیا ہے، جلدی جا کر دروازہ کھولو!"

مگر وہ ہمارے رعب میں نہ آئی اور کہنے لگی "جو بولے وہی کنڈا کھولے۔"

ابھی ہم ایک دوسرے کو ٹھیل ہی رہے تھے کہ دفعتاً ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ فقیر صاحب جو یہ سمجھے کہ گیٹ تھپتھپانے کی آواز اندر نہیں جارہی، انہوں نے گلی میں چہار اطراف گردن گھما کر دیکھا اور پھر نہایت پھرتی سے کھڑے ہو کر گھنٹی بجائی اور پھر جلدی سے بیٹھ کر گدڑی پاؤں پہ ڈال لی۔ یہ سب کچھ منٹ کے ہزارویں حصے میں ہوگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم لوگ اوپر سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے تو ہم لوگ دنگ رہ گئے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ پھر

ہم دوڑتے ہوئے الانگتے پھلانگتے نیچے پہنچے کہ "جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچائیں۔"

گیٹ کھولا "ارے یہ بیل کس نے بجائی تھی؟" ہم نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ جی...... ایک آدمی ادھر سے جارہا تھا...... میں نے بولا ذرا گھنٹی بجادو۔"

"ہُم! تو جھوٹ بھی بولتے ہو؟"

"ہاں جی!" اس نے نہایت ڈھٹائی سے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔" جس پر ہم چراغ پا ہوگئے "شرم نہیں آتی...... فراڈیئے کہیں کے!"

فقیر نے برا سامنہ بنایا۔ اسی اثنا میں سامنے والے گھر سے ایس پی شجاعت نکل آئے جو اس وقت وردی میں تھے انھیں دیکھ کر فقیر ایسا چمپت ہوا جیسے اس کے پیچھے کتے چھوڑ دیئے گئے ہوں اور اس تیزی سے سڑک پر پھسلتا ہوا گیا گویا اسکیٹنگ کر رہا ہو۔

کچھ فقیروں کو اللہ تعالیٰ خوش گلو ہونے کی اضافی خوبی عطا کرتا ہے۔ ایسے فقیر زیادہ کما لیتے ہیں۔ ایک روز ہماری عقبی گلی میں ایک فقیر مغرب کے وقت نہایت پرسوز اور دلدوز آواز میں گاتا ہوا داخل ہوا۔ دھن اور بولوں کی ترتیب تو یاد نہیں تھی مگر بات کچھ اسی قسم کی تھی کہ "ساتھ روٹی کپڑا نہ مکان جائے گا، تن پہ چند گز کفن کا کپڑا ہی جائے گا (پہلے مصرعے کو کھینچ کر پڑھیں تو وہ دوسرے مصرعے کے برابر ہو جائے گا) اللہ کے نام پہ بھوکے کو کھانا کھلا دو...... دو روز سے فاقہ ہے...... تن پہ کپڑے نہیں ہیں۔"

فقیر نے نثر و نظم کے امتزاج سے کچھ ایسا جادو جگایا کہ دل موم ہوتا محسوس ہوا۔ ہماری بہن جو ایسی باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر لیتی ہے فوراً بھبھک گئی۔

دل پہ ہاتھ رکھ کر بولی "اللہ! دیکھو کتنی صحیح بات کہہ رہا ہے...... ہے نا!"

"ہیں! یہ کہنا کیا چاہ رہا ہے؟ یعنی ہم چند گز کفن کا کپڑا رکھ کر باقی روٹی کپڑا مکان اس کے حوالے کردیں؟" ہم نے تشویش ظاہر کی۔

بہن نے ہماری بات پہ کان نہ دھرے اور فقیر کو کھانا دینے چل دی کھانا کھاکر اس نے پانی مانگا، پھر کپڑا مانگا اور پھر پرانے جوتوں کی ضد کرنے لگا۔ الغرض اس کی "مانگیں" بڑھتی ہی گئیں، وہ اپنے طے شدہ پروگرام پر مرحلہ وار عمل پیرا تھا۔ ہم اس کی نیت پہلے ہی بھانپ گئے تھے لہٰذا خدشہ ہوا کہ اب کہیں مکان کے کاغذات نہ مانگ لے۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ باہر نکلیں اور کہیں کہ "یہ لو چند گز کپڑا...... اور چلتے پھرتے نظر آؤ!" مگر اب وہ اگلی گلی کے باسیوں کا ایمان جھنجھوڑنے کی فکر میں تھا لہٰذا خود ہی روانہ ہوگیا۔

فقیروں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں بعض فقیر مفاہمت اور مصالحت پسند ہوتے ہیں ان کی صدا یہ ہوتی ہے کہ "جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اسکا بھی بھلا۔" (دل میں خواہ کچھ بھی کہتے

رہیں) اس کے برعکس ایسے بھی فقیر دیکھنے میں آئے ہیں جو ایسی دھونس جماتے ہیں جیسے ان کا قرض کھایا ہو اور اگر انہیں نہ دو تو ایسی ناقابلِ اشاعت باتیں سناتے ہیں کہ الامان الحفیظ! ایسے ہٹے کٹے، مسٹنڈے اور بدتمیز فقیر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ کراچی کے بازار طارق روڈ پر ایک ایسا خوفناک فقیر پایا جاتا ہے کہ دہشت کے مارے بندہ اس کو کچھ دیئے بغیر نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کے سفید بال حیرت انگیز طور پر کھڑے رہتے ہیں، گونگا نہیں ہے مگر ہر کسی سے بولنا پسند نہیں کرتا۔ بس سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر اپنی چیل جیسی سرخ سرخ آنکھوں سے اس وقت تک گھورتا رہتا ہے جب تک گڑبڑا کر آدمی روپیہ دو روپیہ نکال کر چلتا نہ کر دے۔ یہ غنڈہ ٹیکس ہوتا ہے؛ بھیک نہیں! ظاہر ہے ڈر کے مارے آدمی اپنی جیب ڈھیلی کرے تو یہ غنڈہ ٹیکس ہی ہوا۔

بعض فقیر بظاہر بڑے مظلوم اور مسکین دکھائی دیتے ہی مگر درحقیقت بڑے گھنے اور فراڈیئے ہوتے ہیں۔ اب ایک ایسے فقیر کا قصہ سنئے جس سے سابقہ پڑنے کے بعد ہمارا دل فقیروں کی برادری سے کھٹا ہو گیا۔ جون کی چلچلاتی دوپہر کا ذکر ہے ایک فقیر کی صدا سنائی دی "ہے کوئی اللہ کا بندہ! جو اس غریب محتاج کی مدد کرے۔" ہماری گلی میں تقریباً سب ہی اللہ کے بندے ہیں مگر اس وقت کسی نے ہمارے علاوہ دروازہ نہ کھولا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک خستہ حال، عمر رسیدہ اور نیم مردہ فقیر ننگے پاؤں چلا آرہا ہے۔ اس کا جسم کچھ ایسا تھا کہ اگر ہم چاہتے تو آسانی سے تہہ کر کے اسے الماری میں رکھ سکتے تھے۔ (مگر ہم رکھتے کیوں؟) ہمیں دیکھ کر وہ کمبل ہو گیا اور اپنے مطالبات پیش کرنے شروع کر دیئے، "کوئی پرانا شلوار قمیص، کوئی پھٹا پرانا جوتا..... اللہ تمہارا بھلا کرے۔" دل کٹ کہ رہ گیا کہ بیچارہ جلتی دوپہر میں پتھریلی زمین پہ برہنہ پا گھوم رہا ہے۔ ہم نے بہن کو بتایا تو اس کی رحمدلی نے فوراً جوش مارا اور اس نے ابو کے پرانے جوتے کسی سے پوچھے تاچھے بغیر فقیر کو دے دیئے جو کچھ ایسے پرانے بھی نہ تھے۔ فقیر نے جوتے پاؤں میں ڈال لئے، اس بار ہمیں بہن کی دریا دلی پہ غصہ نہ آیا کیونکہ بیچارہ واقعی مستحق تھا۔ چند ہفتوں بعد ایک روز ہم لوگ اپنی ایک سہیلی کے گھر سے نکلے جو ذرا فاصلے پر مگر ہمارے ہی بلاک میں ہے۔ کیا دیکھا کہ وہی فقیر صاحب ننگے پاؤں گھسٹتے چلے آرہے ہیں اور صدا لگا رہے ہیں، غریب کو کوئی پرانا جوتا، کوئی شلوار قمیص دے دو، دل چاہا کہ ابھی سہیلی کے گھر سے دو جوتے اٹھائیں اور اس کے سر پر گن کر لگائیں۔ ہم نے غصہ بہن پہ اتارا۔ "دیکھا! ان لوگوں کی بات پہ تو کبھی یقین ہی نہیں کرنا چاہئے..... سب اول درجے کے فراڈیئے ہوتے ہیں....."

ہماری بہن جو "کہانی نگار" بھی ہے پُرخیال انداز میں بولی "ہو سکتا ہے اس نے جوتے کسی کو دے دیئے ہوں..... مثلاً..... اپنے

بوڑھے باپ کو!"

"بوڑھے باپ کو؟ مگر یہ تو خود ستر سال کا ہے، اس کا باپ کہاں ہو گا؟ اور اگر ہو گا بھی تو تم خود سوچو، سو سال کی عمر میں وہ جوتے پہن کر کرے گا کیا؟"

چھوٹی بہن کی طرح ہماری بڑی ہمشیرہ بھی فقیروں کے لئے دل میں نہایت نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ اسی فقیر نوازی کے سلسلے میں ایک فقیر پر بچپن سے ہی بڑی مہربان تھیں۔ اتفاق سے وہ بھی اندھا تھا۔ ہمیشہ اسے حتی المقدور نوازتی رہیں۔ پھر ایک دن اچانک وہ فقیر غائب ہو گیا، آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی، کافی عرصہ گزر گیا تو طے یہی پایا کہ ضرور مر کھپ گیا ہو گا کیوں کہ اسکے بیان کے مطابق اسے سترہ موذی بیماریاں تھیں (دروغ بر گردنِ راوی) پھر ہوا یوں کہ ہمشیرہ صاحبہ شادی کے بعد ضلع شرقی سے ضلع وسطی جا پہنچیں، ایک روز ہم لوگ ہمشیرہ کے گھر پہنچے۔ ابھی سلام دُعا کا ابتدائی مرحلہ چل ہی رہا کہ گلی کی جانب سے ایک فقیر کی دردناک آواز سنائی دی۔ نجانے اس کے گائیکی کی لے میں کیا جادو تھا کہ ہمشیرہ صاحبہ ہمیں چھوڑ چھاڑ دروازے کی جانب لپکیں۔ ہم بھی پیچھے ہو لئے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ہمشیرہ کا پسندیدہ، گم گشتہ اور فوت شدہ فقیر اپنا مخصوص ترانہ گاتا چلا آ رہا ہے۔ ہمشیرہ صاحبہ انگشت بہ دنداں رہ گئیں۔ حیران وہ اس بات پر نہیں تھیں کہ وہ زندہ تھا بلکہ ششدر اس پر تھیں کہ وہ فقیر جو ان کے میکے میں اندھا بن کر ٹامک ٹوئیاں مارتا تھا یہاں لنگڑا بن کر مٹر گشت کر رہا تھا۔ ہمشیرہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مبادا کہ نگاہ کا دھوکہ ہو، مگر بچپن سے جس فقیر کو دیکھتی چلی آ رہی ہوں اُسے پہچاننے میں کیونکر غلطی کر سکتی تھیں۔ فقیر صاحب اپنی ترنگ میں آگے بڑھتے رہے۔ ہمشیرہ کو کھڑا دیکھا تو اپنی جگر مگر کرتی آنکھوں کو گھما کر بولا "اللہ کے نام پہ اس لنگڑے محتاج کی مدد کرو!" ہمشیرہ سے رہا نہ گیا تو ذرا ڈپٹ کر بولیں "ارے! پہلے تو تم اندھے ہوا کرتے تھے، اب لنگڑے کیسے ہو گئے؟" یہ سنتے ہی وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ دونوں بے ساکھیاں بغل میں دبائیں اور سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اس موقع پہ وہ صاف مکر جاتا کہ میں تو وہ نہیں..... یا بہرہ بن جاتا گویا کچھ سنا ہی نہ ہو، تو ہم لوگ کیا کر لیتے مگر نجانے اسے بھاگنے کی کیا سوجھی؟ اسے بھاگتا دیکھ کر دل میں آیا کہ چیخ کر کہیں "تو اگر لنگڑا نہیں بنتا، نہ بن، اندھا تو بن!"

اب فقیری باقاعدہ اور باضابطہ پروفیشن بن گئی ہے۔ آپ نے مثل سنی ہو گی، سخی سے سُوم بھلا جو تُرت دے جواب!، مطلب یہ کہ فقیروں کے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا کہ وہ تماشا کہ ہاں گھنٹوں کھڑے دروازہ بجاتے رہیں۔ للذا فقیروں کا کہنا ہے کہ اس سخی سے جو دینے میں گھنٹوں لگا دے وہ کنجوس بھلا ہے جو جلدی سے "معاف کرو بابا" کہہ دیتا ہے۔ مگر بعض فقیر ایسے بھی ہوتے ہیں جو "معاف کرنے" کے قائل نہیں ہوتے۔ ایسے

کمبل ہوتے ہیں کہ گالیاں کھا کہ بھی بے مزہ نہیں ہوتے۔ بس جان کو ہی آجاتے ہیں۔ بازاروں میں بسا اوقات ننھے منے فقیر خواتین کے برقعوں سے چمگادڑوں کی طرح الٹے لٹک جاتے ہیں تا آنکہ انھیں کچھ دے دلا کر (برقعہ نہیں روپیہ) پیچھا نہ چھڑا لیا جائے۔

پہلے فقیر آٹا مانگا کرتے تھے اب آٹے کے لئے پیسہ مانگتے ہیں۔ ایک روز ایک فقیر صاحب نے دروازہ دھڑ دھڑا کر ہمیں مطلع کیا کہ "میرے گھر آٹا ختم ہو گیا ہے، دو روز سے فاقہ ہے۔ پیسے دے دو!" ہم نے روپیہ تھمایا تو تنک کر بولا "روپے میں کونسا آٹا آتا ہے؟"

"ارے!! تو کیا پوری بوری کے پیسے ہم ہی سے لو گے؟" ہم نے احتجاج کیا تو وہ بڑبڑاتا ہوا پڑوسی کو یہ آٹا ختم ہونے والی دلخراش خبر سنانے چل دیا۔

ایک دن بیچ دوپہر کو کسی نے چلا کر بتایا کہ وہ یتیم ہو گیا ہے اور یتیموں کی مدد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو یہ "یتیم" لگ بھگ چالیس برس کا تھا، چنانچہ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس چالیس سالہ یتیم کی ہر گز مدد نہ کریں گے۔ کیونکہ اب اسے "اپنی مدد آپ" کرنی چاہئے۔ ابھی ہم دروازہ بند کر ہی رہے تھے کہ ہماری نگاہ اس کی قبا (لمبے چوڑے سرخ ہرے پیوند لگ لبادے) کے عقب میں جا پڑی۔ دو گندے سندے بچے ننگے پاؤں کچھ کھاتے کھلاتے اس کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ ہم ٹھٹھک گئے۔ فقیر نے دوبارہ صدا لگائی۔ اب اس کے مخاطب براہِ راست ہم تھے، "میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی مدد کرو۔ اللہ ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ (شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خود بھی کسی بلا سے کم نہیں) سابقہ تجربات کے سبب ہمارا دل فقیروں کی طرف سے کھٹا ہو چکا تھا، اس عدم اعتماد کے باعث ہم نے انکوائری کا فیصلہ کرتے ہوئے سرسری لہجے میں بچے کو مخاطب کیا "کیوں..... بھئی! تمہارے ابا کہاں ہیں؟" ہم نے بچے کو گھیرنے کے لئے اندازِ سخن کچھ ایسا رکھا جیسے ہم اس کے ابا سے واقف ہوں یا ہمیں ان سے کچھ کام ہو! خیال یہی تھا کہ شاید وہ بچپنے، میں فوراً اگل دے گا کہ ابھی بلاتا ہوں! یا یہ کہ "یہ ساتھ ہی تو کھڑا ہے!" مگر افسوس بچہ بڑا گھاگ نکلا، جال میں نہ آیا۔ رٹے ہوئے سبق کی طرح سپاٹ لہجے میں بولا، "مر گیا!"

ہم نے پوچھا "کب؟"

کہنے لگا "بچپن میں ہی!"

ہم نے کہا "کس کے بچپن میں..... تمہارے یا اپنے؟"

کہنے لگا "معلوم نہیں جی!"

پھر بچے نے پریشان ہو کر اپنے چالیس سالہ بے آسرا بھائی کی طرف دیکھا جیسے اس سوال کا جواب اسے معلوم ہو۔ پھر ہم بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اچھے خاصے ہو..... کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

فقیر نے پہلے تو اس گھسے پٹے سوال پر منہ بنا کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا پھر بولا "بھکاری نہیں ہوں جی........ بیماری سے لاچار ہوں........ اللہ جنت کے باغ دکھائے۔"

ہمیں یقین تھا کہ جنت کا ٹکٹ ہمیں ایسے ہٹے کٹے مسٹنڈے فقیروں کی مدد کرنے سے حاصل نہیں ہو گا۔ ویسے بھی اب ہمیں اس کی شکل کچھ "بردہ فروش" جیسی لگ رہی تھی، چنانچہ ہم نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ اس طویل انکوائری کے بعد بغیر کچھ دیئے دروازہ بند کر دینے پر فقیر چابلایا تو بہت ہو گا مگر ہم نے مطلق پروانہ کی۔

ساتھیو! آپ یہ مضمون پڑھ کر سوچ رہے ہوں گے کہ کیا ہمارے محلے میں دن رات فقیروں کا میلہ لگا رہتا ہے جو ہر نمونے کے فقیروں سے ہمارے مذاکرات ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ ہمیں کوئی کام دھندہ نہیں جو دن رات فقیروں کے پیشہ ورانہ معاملات میں دخل اندازی کرتے رہتے ہیں تو جناب بات یہ ہے کہ ہمارے محلے میں تو فقیر بہت ہی کم آتے ہیں یہ چند روزہ قصہ نہیں ہے بلکہ یہ مضمون ہماری پوری زندگی کے ماہ و سال کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اب یہ مت پوچھئے گا کہ عمرِ رفتہ کے ماہ و سال کتنے تھے اور ان کو نچوڑنے پر فقیر کتنے نکلے!!!

سانحہ

○ ..... تم اپنے اس دوست سے ملے ہو جس نے پیدل چلنے والوں کے لئے مفید ہدایات مرتب کی تھیں اور انہیں چھپوانا چاہتا تھا؟

"نہیں، کیونکہ وہ کتاب چھپنے سے قبل ہی وہ ایک بس کے نیچے آ گیا اور مر گیا تھا۔"

خواہش

○ ..... بچہ..... "ابا جان چچا جان کی داڑھ میں درد ہے اور وہ ہسپتال جا رہے ہیں میں بھی جاؤں؟"

باپ..... "تم وہاں کیا کرو گے؟"

بچہ..... "میں چچا جان کو روتا ہوا دیکھوں گا۔"

صحیح استعمال

○ ..... "منا (امی سے) "امی آج اسکول میں سب بچے کہہ رہے تھے کہ میری ٹوپی گندی ہے"

امی..... "نہیں بیٹا جھوٹ بولتے ہیں" دوسرے دن بیٹا پھر وہی شکایت لے کر آیا تو ماں نے اسے تسلی دی اور کہا "بیٹا کہا نا وہ جھوٹ بولتے ہیں اچھا اب جلدی سے ٹوپی مجھے دو تمہارے ابو کب سے مانگ رہے ہیں۔"

"مگر کس لئے امی؟" منے نے پوچھا.....

"انہیں سبزی لانی ہے" امی نے اطمینان سے جواب دیا۔

(مرسلہ..... سہیل عباس ساہیوال)

چابی

نعیم مشتاق نومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک جادوگر تھا۔ نام تھا اس کا "ولی"۔

اس کے پاس ایک چابی تھی۔ عجیب و غریب شکل کی، اور تھی بھی عام چابیوں سے بڑی۔

ہوا یوں کہ ولی کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھول گیا کہ وہ چابی کس چیز کی تھی؟ کس "تالے" کی تھی؟

ولی نے یاد کرنے کی بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے یاد آجائے۔ وہ چابی کس تالے کی ہے؟ مگر ناکام رہا۔

"مجھے کسی سے پوچھنا چاہئے۔" اس نے سوچا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

سب سے پہلے وہ مٹھائی کی دکان پر گیا۔

"یہ چابی کس شے کی ہے؟" اس نے حلوائی کو اپنی بڑی چابی دکھائی۔ حلوائی نے چابی کو ہاتھ میں پکڑ کر غور سے دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلا کر

بولا۔

"دوست! مجھے افسوس ہے، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ...... سوری! ......"

"کوئی بات نہیں!" ولی نے کہا۔ "میں پولیس مین سے پوچھ لوں گا۔" وہ پولس مین کے پاس گیا۔ "کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟" ولی نے اس سے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟" پولیس مین مسکرا کر بولا۔ "بولو، کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ چابی کس تالے کی ہو سکتی ہے؟" ولی نے پوچھا۔

پولیس مین چند لمحے چابی کو بغور دیکھتا رہا۔ اسے بھی سمجھ نہ آیا کہ یہ عجیب و غریب چابی کس تالے کی ہو سکتی ہے؟

"سوری دوست!" پولیس مین نفی میں سر ہلا کر بولا۔

"اب میں کبھی کوئی چیز نہیں بھولوں گا۔" ولی نے اپنے آپ سے کہا۔ اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے سوچا۔ "کیا کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکے گا؟"

تھوڑی دیر بعد وہ ایک اسکول ماسٹر سے ملا۔ جو کہ سخت غصّے میں تھا۔

وہ کوئی سخت گیر ٹیچر دکھائی دیتا تھا۔

ولی نے اس سے چابی کے بارے میں پوچھا۔

"یہ چابی کس کی ہو سکتی ہے؟"

حقیقت حال

ایک بوڑھا شخص بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ بیٹھی تھی مگر وہ کھانے کے بجائے اس کا منہ تک رہی تھی۔ ایک شخص نے بوڑھے سے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی تم اپنی بیوی کے سامنے بیٹھ کر کھا رہے ہو اور اسے کھانے کو پوچھتے نہیں ہو۔" بوڑھے نے کہا۔ "معاملہ یوں نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم دونوں کے پاس صرف ایک بتیسی ہے اور میری بیوی میری بتیسی کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔"

مرسلہ ...... آصف علی خان ــــ شاہدرہ

اسکول ماسٹر نے تیوری چڑھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"یہ چابی!" اس نے کہا۔ "اس سے تم اپنی یادداشت کا تالا کھولو ...... تاکہ تمہیں یاد آئے ...... یہ چابی کس تالے کی ہے؟"

ولی نے تالی بجا کر اسے داد دی۔ اور وہ اسکول ماسٹر "اونہہ!" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"اب پتا چلا، یہ میری یادداشت کی چابی ہے۔" ولی نے کہا۔ "اور میری یادداشت میرے سر میں ہے۔ اس لئے مجھے اپنے سر کو کھولنا چاہئے ...... ہاں، بالکل! ......"

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

سوال نمبر ۱

جیمس نے تہران سے اپنے دوست ڈیوڈ کو لندن میں وہاں کے وقت کے مطابق ایک بج کر پینتالیس منٹ پر فون کیا۔ ان کی گفتگو تیس منٹ تک جاری رہی۔ ڈیوڈ نے ساڑھے پانچ گھنٹے کے بعد جوابی فون کرنے کا وعدہ کیا اور وقت مقررہ پر فون کیا۔ اس بار بھی انہوں نے آدھے گھنٹے تک بات کی۔ تہران میں مقامی وقت کے حساب سے شام چھ بجے سے پہلے لندن فون کرنے کے چارجز ۲ روپے فی منٹ ہیں۔ جبکہ شام چھ سے آئندہ صبح سات بجے کے درمیان یہ ریٹ آدھے ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف لندن سے تہران فون کرنے کے چارجز شام آٹھ بجے سے پہلے دو روپے فی منٹ ہیں اور شام آٹھ سے آئندہ صبح سات بجے تک یہ ریٹ آدھے ہوجاتے ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ ان دو ٹیلیفون کالز کے کل اخراجات کتنے ہوئے؟ دھیان رہے تہران کا وقت لندن کے وقت سے چار گھنٹے آگے ہے۔

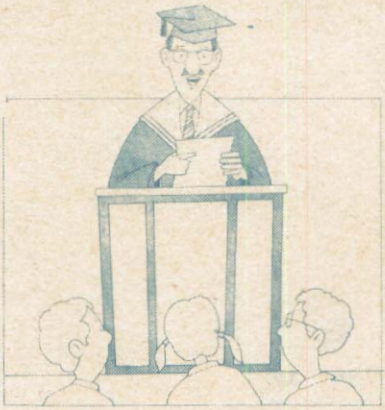

سوال نمبر ۲

یونیورسٹی کے آخری امتحان میں پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد فیل ہونے والے طلبہ سے زیادہ ہے۔ اگر پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد کا ۵/۱ حصہ فیل ہوجاتا ہے تو پاس اور فیل ہونے والوں کی تعداد برابر ہوتی اور اگر فیل ہونے والے طلبہ کی تعداد کا ۵/۱ حصہ پاس ہوجاتا تو پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد فیل ہونے والوں سے ۱۶ زیادہ ہوتی۔ بتایئے پاس اور فیل ہونے والے طلبہ کی تعداد کیا تھی؟

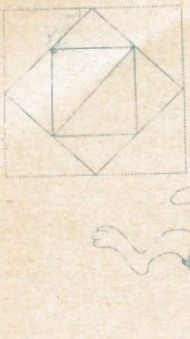

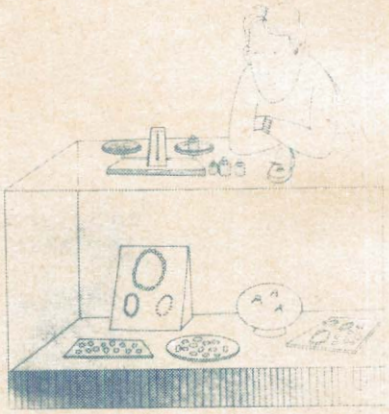

سوال نمبر ۳

نصیر ایک سنار ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سے دکان ہے۔ ایک سے پندرہ گرام تک سونا تولنے کے لئے اس کے پاس صرف چار باٹ ہیں۔ بتایئے تو وہ کون کون سے باٹ ہیں؟

سوال نمبر

دی گئی شکل کو اس طرح بنایئے کہ ایک بار بھی پنسل اٹھنے نہ پائے اور نہ ہی کوئی لائن دو بار کھینچی جائے۔

اس مقابلے میں ہم آپ سے حسابی نوعیت کے اور کامن سنس کے صرف چار سوالات پوچھتے ہیں بالکل صحیح جواب دینے والے ذہین ساتھی کو ایک عدد

کیلکولیٹر

انعام کے طور پر دیا جاتا ہے۔ زیادہ تعداد میں صحیح جوابات موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جاتا ہے

مقابلے میں شرکت کی شرائط حسب ذیل ہیں

۱۔ جوابات واضح، صاف اور خوش خط لکھئے۔

۲۔ جوابات ماہ رواں کی مبارہ تاریخ تک ادارے کو موصول ہو جائیں۔

۳۔ بالکل الگ لفافے میں الگ کاغذ پر صرف جوابات اور بھیجنے والے کا مکمل پتہ درج ہو۔ تاخیر سے اور پتے کے بغیر موصول ہونے والے خطوط کو مقابلے میں شریک نہیں کیا جائے گا

پتہ

انچارج انعامی مقابلہ "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا"

ماہنامہ "آنکھ مچولی" اپنی آئی بی کالونی کراچی ۷۴۸۰۰

الدین قریشی، کراچی۔ شاکرہ نسیم، کراچی۔ مظہر اقبال، نریال کھاریاں۔ ثناء بشیر، گجرات۔ عابد حمید بلوچ، تربت۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ یاسر رزاق، کوئٹہ۔ آسیہ عائش، ساہیوال۔ امتنان شاہد، فیصل آباد۔ محمد منیر صدیقی، کراچی۔ منصور شوکت، راولپنڈی۔ سعدیہ اختر، اسلام آباد۔ اصباح ارم، بہاولپور۔ فرطہ ارم، بہاولپور عبد البصیر، ڈی جی خان۔ انوار الحق، مردان۔ انجم جاوید، لاہور۔ سفینہ ناز، فیصل آباد۔ یاسر بن نثار، راولپنڈی۔ شہزاد محمود، لاہور۔ عدنان صابر، محمد ظفر صدیقی، حیدر آباد۔ حاجی شہزاد حسین اعوان، ملتان۔ شمیر نور علی، کراچی۔ طاہر اقبال سومرو، خیرپور سادات۔ صائمہ صلاح الدین، بنوں عاقل۔ پرنس ملک سرفراز احمد، ملتان۔ اے حمید، کراچی۔ احتشام رضا عارف، ٹوبہ ٹیک سنگھ، حافظہ صدیقہ طاہرہ، لاہور۔ اشفاق احمد ناز، کراچی۔ حنا رحمن، کراچی۔ علی رضا صدیقی، پشاور۔ سید عامر رضا، کراچی۔ محمد حنیف صدیقی بندھانی، سکھر۔ سعدیہ رئیس، کراچی۔ اقراء باری۔ فیصل آباد۔ بابر کمال، راولپنڈی۔ رفعت مختار، منڈی مرید کے۔ صداقت حیات شاہد، اٹوہ۔ عرینب قریشی، کراچی۔ ارم فاطمہ، سکھر۔ محمد عرفان جہانگیر، میرپور خاص۔ نور سعید، اٹک۔ حبیب احمد، آزاد کشمیر۔ رفاقت محمود عالم، ڈھڈیال۔ آفتاب حسین، اسلام آباد۔ حسنین رضا خان، پنڈدادنخان۔ محمد کلیم، کراچی۔ اظہر حسین، آزاد کشمیر۔ محمد انور باری، کوہ مری۔ مسرور اختر، بہاولپور۔ وسیم شاہد، سکھر۔ خالدہ جبین اعوان، کراچی۔ محمد خالد صدیقی، کراچی۔ لبنیٰ اظہر خان، حیدر آباد۔ عرفان، راولپنڈی۔ سلمان احمد، کراچی۔ الماس زہرا، بوریوالہ۔ مہتاب حیدر، لیہ۔ گل زرین مغل، ایبٹ آباد۔ مہر احمد نواز لیل، شورکوٹ۔ سید امیر امام نقوی، کراچی۔ شہزاد واسطی، لاہور۔ انجم مقبط، ثمائزہ مقبط، فاطمہ مقبط، لاہور۔ احمد توصیف قاسمی، کراچی۔ محمد عرفان، کراچی۔ کاشف خان، ایبٹ آباد۔ تنویر احمد، ڈی جی خان۔ مجاہد حسین، کراچی۔ اعجاز احمد، فیصل آباد۔ انیل کمل آزاد، بدین۔ احسن رضا خان، راولپنڈی۔ اینٔی حسنات، کمالیہ۔ احمد فرقان، ملتان۔ جویریہ گل، کراچی۔ حافظ قاسم مسعود، لاہور۔ حافظہ خولہ کوثر، لاہور۔ فہیم قمر شیخ۔ حیدر آباد۔ میاں فیاض احمد، میانوالی۔ حاجی خادم حسین، اسلام آباد۔ محمد علی سومرو، محمد عمر سومرو، خیرپور سادات، محمد رفیق قریشی، حیدر آباد۔ زبیر احمد مزاری، سکھر۔ ندیم یوسف، لاہور۔ انعام اللہ، ڈی آئی خان۔ نیلوفر نعیم، (؟) محمد عابد قلی، کراچی۔ آصف قریشی، واہ کینٹ۔ عافیہ صفدر، خوشاب۔ محمد خرم ٹیپو، الڑ کانہ۔ نصر من اللہ ترین، کوئٹہ۔ سید ابراہیم علی شاہ، پشاور۔ سید مرتضیٰ امیر حسن کاظمی، حاصل پور منڈی۔ دانش امجد کرمانی، حیدر آباد۔ شہنیلا صدف، کراچی۔ محمد نعیم عابد، کمالیہ۔ محمد بلال بخاری، کوٹ ادو۔ عظمیٰ انیس، کراچی۔ منتہیٰ مہر، کراچی۔ نعمان زکریا، کراچی۔ سید فرحان رضا زیدی، لاہور۔ محمد سمیع انصاری، کراچی۔ رباب حسن، لاہور۔ فرخ نسیم، حیدر آباد۔ نواب علی پریمی، سانگھڑ۔ وقاص خان، حیدر آباد۔ عماد فاروق خان، سکھر۔ سیما عزیز، لاہور۔ محمد احسن رفیق شاہ، لاہور۔ سید عبید الرحمن ترمذی، حیدر آباد۔ ساجد کماوی، کمالیہ۔ محمد انوار یوسف، ٹنڈوالہ یار۔ خاور جمال الدین، کراچی۔ کاشف شہزاد، حیدر آباد۔ تابندہ حسین، لاہور۔ محمد عظیم انجم، بی۔ مطیع اللہ ریاض، لاہور۔ سید محمد کامران اقبال جیلانی، فیصل آباد۔ محرم علی ابڑو، پرانا سکھر۔ ہمایوں سعید، ملتان۔ فیصل مختار، ملتان۔ عابدہ ملک، ملتان۔ فیصل مسعود احمد، نواب شاہ۔ طارق محمد صدیقی، کراچی۔ ابوذر غفاری، کوٹ ادو۔ ارم سلیم مغل، سکھر۔ علی رضا ساجد، سانگھڑ۔ تابندہ عباس (؟) نوید فاروق، حیدر آباد۔ جواد سمیع، کراچی۔ ثوبیہ افتخار، لاہور۔ بریرہ سحر، رحیم یار خان۔ سید ممتاز جیلانی، سید عمران جیلانی، سید فیروز جیلانی، سید عرفان جیلانی، کراچی۔ ہما کریم، کراچی۔ عمران حسین، سعدیہ فدا، سلمان حسین، سانگھڑ۔ شازیہ ناز، کراچی۔ سیدہ بینا جلالی، کراچی۔ ثمینہ شمس، کراچی۔ محمد حسین سلطان علی، کراچی۔ پروین ناز، کراچی۔ نوین احمد، کراچی۔ محمد انعام، کراچی۔ مختار احمد پشاور، محمد شاہد، کراچی۔ نعیم احمد خان، کراچی۔ افشاں غوری، حیدر آباد۔ محمد اسمٰعیل جاوید، وہاڑی۔ نسرین بی بی، کراچی۔ چوہدری امجد بشیر ڈھڈیال۔ صائمہ رئیس، کراچی۔ فہد عمران، کراچی۔ فاطمہ طاہر، اسلام آباد۔ سید تنزیل الرحمن، سکھر۔ خالد محبوب، کراچی۔ محمد انور یوسف، ٹنڈوالہ یار۔ سلمان زیب خان، فیصل آباد۔ عبد الرؤف، گوجرانوالہ۔ محمد شکیل بھٹو، دادو۔ تنویر مسعود، لاہور۔ نصیر احمد، ایبٹ آباد۔ عائشہ زمان، کراچی۔ محمد ارشاد، کراچی۔ محمد عبد اللہ صالح، راولپنڈی۔

گزشتہ ماہ کے سوالات کے درست جوابات :۔

۱۔

۲۔ یہ ناممکن ہے کہ تینوں گھروں کو تین دوسری عمارات سے ملایا جائے اور کوئی سڑک ایک دوسری کو قطع نہ کرے۔

۳۔ طاہر اپنی گھڑی کے مطابق آٹھ بجے سے دو یا تین منٹ پہلے بس اسٹاپ پر پہنچ جائے گا جبکہ اس وقت حقیقت میں پونے آٹھ بجنے میں دو یا تین منٹ ہوں گے۔ یعنی وہ وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر ہو گا۔ اس لئے بروقت دفتر پہنچ جائے گا۔ اس کے برعکس بابر اپنی گھڑی کے مطابق آٹھ بجے سے دو یا تین منٹ پہلے بس اسٹاپ پر پہنچے گا جبکہ دراصل اس وقت سوا آٹھ میں دو یا تین منٹ کم ہوں گے۔ اس لئے بس اس سے چھوٹ جائے گی اور وہ تاخیر سے دفتر پہنچے گا۔

۴۔ کشتی میں موجود اسٹیل کے ہر گولے نے اپنے وزن کے مطابق پانی کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ جب یہ گولے پانی کے اندر جا گرے تو انہوں نے اپنے حجم کے مطابق پانی کی جگہ گھیری۔ چونکہ اسٹیل کے گولے پانی سے بھاری تھے۔ اور ان کا وزن ان کے حجم سے زیادہ تھا اس لئے جھیل کے پانی کی سطح پہلے کی نسبت گر جائے گی۔

اس مرتبہ سوالات کچھ مشکل ثابت ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف دو ذہین ساتھیوں کے بالکل درست جوابات موصول ہوئے۔ جن میں سے ایک تو ہیں منڈوالہ یار کے محمد حفیظ اور دوسرے رساپور کے فواد اصغر۔ قرعہ اندازی کے بعد جناب فواد اصغر انعام کے مستحق قرار پائے ہیں۔ ان کا انعام (کیلکولیٹر) انہیں جلد روانہ کر دیا جائے گا۔ ادارہ انہیں اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی :۔

نوید تاج، چشتیاں۔ نعمان فاروق، سرگودھا۔ عامر رحیم ملک، لاہور۔ محمد فرحان خان، حیدر آباد

ایک سے زیادہ غلط جواب دینے والے ساتھیوں کے نام :۔

سجاد حسین، ایبٹ آباد۔ امتیاز احمد، چشتیاں۔ مہوش ضیا، ملتان۔ حاشر امیر، نوشہرہ۔ شکیلہ علاؤالدین، کراچی۔ سید ظفر عباس رضوی، لاہور۔ سلمان اللہ، کراچی۔ رابعہ شیخ، کراچی۔ حسیب حسن، ڈیرہ غازی خان۔ محمد زاہد چغتائی خان، ڈی جی خان۔ جنید صدیقی، حیدر آباد۔ قرۃ العین فخر، ہری پور۔ وسیم احمد صدیقی، کراچی۔ حافظ راشد فاروق، سیالکوٹ۔ محمد فاروق بشیر، گجرات۔ راجہ ماجد جہانگیر، کراچی۔ سہیل احمد شاہد، گوجرانوالہ۔ عبدالرحیم زرتاش، منڈی مرید کے۔ مریم، میمونہ، آمنہ سلطانہ، کراچی۔ خیال محمد، مینگورہ۔ عتیق الرحمن، آزاد کشمیر۔ محمد قاسم حسین شاہ، (؟)۔ عبدالوحید، بھکر۔ خاور جعفری، کراچی۔ راحیل بن یحییٰ، حیدر آباد۔ گلزار عثمانی، کنری۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ نسیم اختر، میانوالی۔ وریشمین، کراچی۔ نورتن شہزادی، جڑانوالہ۔ احسن رضا، بوریوالہ۔ بدر سلطان کلیر، چیچہ وطنی۔ نادیہ تبسم افضل، لاہور۔ نعیم الدین، کراچی۔ امبر غفار، کراچی۔ ابرار عنایت اللہ۔ لالہ موسیٰ۔ رضوانہ بہار نسیم، کراچی۔ غضنفر قریشی، کراچی۔ صفیہ نسیم، کراچی۔ محسن رضا، بوریوالہ۔ شاکر خان، پشاور۔ ناہید غنی، گوجرانوالہ۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔ عدنان احمد صدیقی، کراچی۔ محمد ندیم، کراچی۔ شیخ آصف اقبال، گوجرانوالہ۔ محمد کاشف اعجاز، سکھر۔ صائمہ اعجاز، سکھر۔ صبیحہ مسعود، راولپنڈی۔ خولہ غلام نبی، راولپنڈی۔ بشریٰ بے بی، سانگھڑ۔ اسد عمر، (؟)۔ محمد عبداللہ۔ بہاولنگر۔ محمد خرم قاضی، اسلام آباد۔ نسیم

سوئی دھاگا

آصف فرخی

"اتنی سی بٹیا، گز بھر کی چٹیا۔"

دادی اماں ایک پہیلی پوچھا کرتی تھیں۔ اس پہیلی کا جواب ہے سوئی دھاگا۔ چھوٹی سی سوئی میں لمبا سا دھاگا پرو دیا جاتا ہے۔ پھر سلائی لپاجھپ کپڑوں کی تہوں میں اترنے لگتی ہے۔ ٹکڑوں کو جوڑنے لگتی ہے۔ کپڑے کے مختلف ٹکڑے مل کر ایک لباس بن جاتے ہیں۔ پھر سوئی کی آنکھ سے دھاگہ نکال کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ خالی سوئی کی نوک چبھنے لگتی ہے۔

سوئی پہلے پہل صرف ایک نوکیلا پن تھی۔ پتھر یا ہڈی کا پن چیزوں میں چھید کرنے کے کام آتا تھا۔ ایسی چیزوں کو جوڑنے کے لئے درختوں کے کانٹے یا ہڈی کے ٹکڑے استعمال ہوتے تھے۔

پتھر کے دور میں جب لوگ جانوروں کی کھال کو لباس کے طور پر استعمال کرتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی کھال چھوٹی پڑ جاتی۔ ایسی کئی چھوٹی کھالوں میں پن کے ذریعے چھید کرکے ان میں جانور کی نسیں پرو دی جاتیں تو ایک لباس سا تیار ہو جاتا۔

مگر ایک دن آدمی کو بہت عمدہ سوجھی۔ اس نے پن کے چپٹے حصے کو دو میں بانٹ دیا۔ اور اس شگاف میں نس کو اٹکا دیا۔ پھر جن چیزوں کو جوڑنا تھا، ان میں سے پن اور نس دونوں کو گزار دیا۔ یہ سوئی اور دھاگے کی ابتداء تھی۔

جلد ہی چپٹے حصے کے شگاف کی جگہ ناکے نے لے لی اور یوں سوئی مکمل ہوگئی۔ سوئی نے اپنا کام شروع کر دیا اور سلائی کڑھائی کی ابتدا بھی ہوگئی۔

سلائی کڑھائی کا یہ نو دریافت ہنر پہلے پہل پہننے کے کپڑوں اور کشتیوں کے بادبان سینے اور رفو کرنے تک محدود تھا۔ پھر سلائی سے نازک اور نفیس کام لئے جانے لگے۔ سینا بھی ایک فن کا درجہ اختیار کر گیا۔ ماہر فن ہاتھوں نے ہر قسم کے کپڑے کی حسن کاری کا ڈھنگ سیکھ لیا۔

قدیم بابل، ایران اور چین کے مال دار لوگ

کڑھے ہوئے لباس پہنتے تھے۔ امریکا کے پرانے باشندوں نے پارچہ بافی کو بہت ترقی دے لی تھی اور اپنے لباسوں پر حیرت انگیز نقش و نگار بنایا کرتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے محلوں میں پوری پوری دیواروں کے برابر مناظر کاڑھے جاتے تھے۔ انہیں ٹیپسٹری کہا جاتا تھا اور ان میں جنگی یا تاریخی مناظر کڑھائی کے ذریعے اجاگر کئے جاتے تھے۔ یہ "ہنر مندی" سلائی کی بدولت تھی۔ کڑھائی اور سلائی کے ہنر عورتوں کا دل پسند مشغلہ بن گئے۔ سلیقہ شعار کہلانے کے لئے اس ہنر میں مہارت حاصل کرنا عورتوں کے لئے بہت اہم سمجھا جاتا رہا ہے۔

سوئی کی ایک بدلی ہوئی شکل اون بننے کی سلائی بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سوئی کی جگہ سلائی آگئی ہے۔ اور دھاگے کی جگہ اون۔ اس سے وہ سوئٹر بنے جاتے ہیں جو ہمیں سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اون کی بنوائی پہلی بار اسکاٹ لینڈ میں دریافت ہوئی۔

سلائی کی پہلی مشین ۱۸۳۰ء میں پیرس کے ایک درزی نے استعمال کرنا شروع کی تو سارا یورپ ہکا بکا رہ گیا۔ سلائی مشین کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے لیکن چھوٹی سی سوئی کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ ہزاروں لاکھوں برس کے بعد بھی سوئی کی کاری گری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور آئے بھی کیسے؟ اس کے ذمے دنیا بھر کی رفو گری، بخیہ کاری، پیوند لگانا اور پھٹے کو سینا ہے

نیک نیت۔ بامراد

بیان کیا جاتا ہے شہنشاہ فریدوں کا ایک وزیر بہت وفادار اور خیر خواہ تھا۔ شہنشاہ بھی اس کی قدر کرتا تھا اور یہ بات دوسروں کے لئے باعث رشک و حسد بن گئی تھی۔ حاسد ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ وزیر کی کوئی غلطی معلوم ہو تو شہنشاہ کو اس سے آگاہ کریں۔ اتفاق سے ایک حاسد کو ایک ایسی ہی بات معلوم ہو گئی اور اس نے تاخیر کے بغیر شہنشاہ کو اس سے آگاہ کر دیا۔ اس نے کہا حضور والا یہ کیا ستم ہے کہ حضور تو اس کمینے وزیر پر نوازشات فرماتے ہیں اور وہ حضور کی زندگی کا خاتمہ چاہتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس شرط کے ساتھ روپے قرض دیا کرتا ہے کہ جب شہنشاہ کا انتقال ہو جائے گا تو میری رقم لوٹا دینا چنانچہ حضور کے لشکر میں ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں جنہوں نے وزیر سے اس شرط پر قرض حاصل کیا ہے یہ بات سنی تو بادشاہ غصے میں بھر گیا اس نے اسی وقت وزیر کو بلوایا اور اس سے کہا "اے نالائق یہ کیا بات ہے کہ تو بادولت کی مہربانیوں کا جواب بے وفائی اور بدخواہی سے دے رہا ہے کیا تو یہ کہہ کر لوگوں کو قرض نہیں دے رہا کہ یہ قرض ہماری موت کے بعد وصول کرے گا؟"

وزیر نے کہا خادم نے جن لوگوں کو یہ کہہ کر قرض دیا ہے کہ یہ قرض حضور کی وفات کے بعد وصول کیا جائے گا۔ وہ دن رات یہ دعا مانگتے ہوں گے کہ حضور زیادہ سے زیادہ لمبی عمر پائیں تاکہ انہیں جلد قرض ادا نہ کرنا پڑے اور اس شرط سے خادم کی یہی مراد تھی۔" یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں آگئی۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اس نے وزیر کی تعریف کی اور اسے وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

(مرسلہ۔ محمد اسلام، اٹک)

میاں مرغے

حفیظ الرحمٰن احسن

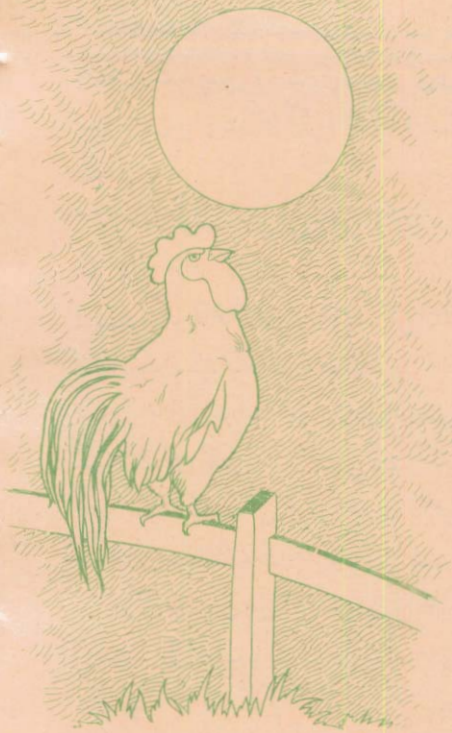

میاں مرغے ...... میاں مرغے
اذانیں کیوں نہیں دیتے
کبھی اونچے ...... کبھی ہولے
وہ ککڑوں کوں، وہ ککڑوں کوں
بھلا اب کیوں نہیں گاتے؟

...... ○ ......

میاں مرغے ...... میاں مرغے
ذرا بولو ...... کہو کچھ تو
اُداس اور چپ کھڑے کیوں ہو؟
کہو آخر، یہ ضد کیسی؟
ہوئی ہے بات کیا ایسی؟
میاں مرغے ...... میاں مرغے

...... ○ ......

میاں مرغے ...... میاں مرغے
میں اب سمجھا، ہے چپ کیسی
خفا ہے تم سے بی مرغی!
بتاؤ تو سہی ہم کو
ہوئی ہے کب سے یہ کُٹّی؟
میاں مرغے ...... میاں مرغے!

...... ○ ......

بس اب چھوڑو یہ ضد اپنی
یہ غصہ تھوک دو جلدی
سنا دو پھر ہمیں پیارے
اُسی دُھن میں، اُسی لے میں
کبھی اونچے ...... کبھی ہولے
اذانیں اور وہی تانیں
وہ ککڑوں کوں، وہ ککڑوں کوں
لو میں بھی ساتھ گاتا ہوں
ککڑوں کوں، ککڑوں کوں
میاں مرغے ...... میاں مرغے

ڈرپوک کہیں کا

ننھے منے پیارے پیارے بچوں کے لئے راحت صلاح الدین کا دلچسپ ڈرامہ

کردار :-

علی

غزالہ ..... علی کی بہن

وسیم ..... علی کا دوست

نوین ..... وسیم کی بہن

پہلا منظر

(علی کے گھر میں بہت ہنگامہ ہو رہا تھا کیوں کہ علی کی سالگرہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا اور اپنی بہن غزالہ کے ساتھ مل کر کل کی تیاری مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک بیل بجنے کی آواز آتی ہے تو غزالہ دروازہ کھولنے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے وسیم بھی موجود ہوتا ہے)

وسیم ..... (کمرے میں داخل ہوتے ہی اِدھر

اُدھر دیکھتے ہوئے بولا) "اوہو..... یہاں تو خوب زور و شور سے تیاری ہو رہی ہے۔"

غزالہ ..... "تیاری تو زور و شور سے ہی ہوگی۔"

وسیم ..... (مسکراتے ہوئے) "کل فرسٹ اپریل جو ہے۔"

(غزالہ بھی جواباً مسکراتی ہے۔ علی جو وسیم کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا وسیم کا جملہ سن کر اسے گھور کر دیکھتا ہے تو غزالہ فوراً بولتی ہے،)

غزالہ ..... "اور کل علی کی سالگرہ بھی تو ہے۔"

علی ..... (وسیم کو بدستور گھورتے ہوئے بولا) "میں سب جانتا ہوں تم کل مجھے میری سالگرہ پر اپریل فول بناؤ گے۔"

غزالہ ..... ارے نہیں علی، بھلا وسیم بھائی کیوں تمہارے ساتھ اپریل فول منائیں گے؟

وسیم ..... "اور کیا..... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے بنے بنائے کو فول بنانے کی؟"

علی ..... (ناراضگی سے) "مجھے سب معلوم ہے کاش! میں اپریل کی پہلی تاریخ کو پیدا نہ ہوا ہوتا۔"

وسیم ..... "اب کیوں کہہ رہے ہو علی، تم کو ہی جلدی تھی۔"

علی ..... (حیران ہوتے ہوئے) "کس بات کی؟"

وسیم ..... "اس دنیا میں آنے کی جبھی تو اللہ میاں نے تم کو سزا دینے کے لئے اس دن پیدا کر دیا۔"

(وسیم کی بات سن کر غزالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور علی وسیم کو اس طرح گھورنے لگا جیسے ابھی کچا ہی تو چبا جائے گا۔ وسیم نے علی کو یوں گھورتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے چہرے پر مصنوعی گھبراہٹ لاتے ہوئے جانے کے لئے مڑ گیا)

غزالہ ..... (اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے) "کیا ہوا وسیم بھائی؟"

وسیم ..... "ک..... کک..... کچھ نہیں۔ بس، اب میں چلتا ہوں۔"

غزالہ ..... "کیوں.....؟"

وسیم ..... "وہ..... دراصل مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔"

(یہ کہہ کر وسیم فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ غزالہ وسیم کی بات پر دیر تک ہنستی رہی اور علی بُرے بُرے منہ بنا کر غزالہ کو دیکھتا رہا)

دوسرا منظر

(ایک کمرے میں بہت سلیقے سے چیزیں رکھی ہوئیں تھیں۔ یہ وسیم کا کمرا تھا۔ کمرے کے ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پلنگ کے پاس ہی ایک میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز کے ایک جانب کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ قریب ہی ایک خوبصورت سے گلدان میں تازہ تازہ رنگ برنگے پھول اپنے خوشبو بکھیر رہے تھے۔

وسیم کمرے میں داخل ہوتا ہے اور کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگتا ہے کہ کل علی کی سالگرہ پر علی کو کس طرح فول بنائے؟ اچانک وسیم کے ذہن میں ایک

ترکیب آجاتی ہے اور وہ مسکرا دیتا ہے۔ اسی وقت وسیم کی بہن نوین کمرے میں داخل ہوتی ہے اور وسیم کو مسکراتا ہوا دیکھ کر اس سے وجہ دریافت کرتی ہے۔)

نوین ..... "یہ کس خوشی میں مسکرایا جا رہا ہے؟"

وسیم ..... "کل فرسٹ اپریل ہے۔"

نوین ..... "اچھا تو کسی کو بے وقوف بنانے کا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ بے چارہ کون ہے جو تمہارے ہاتھوں بے وقوف بنے گا؟"

وسیم ..... "بے وقوف تو نہیں..... ہاں البتہ اس بے چارے کو ڈرانے کا پروگرام ضرور ہے۔"

نوین ..... "مگر یہ تو بتاؤ آخر کسے ڈرانے کا پروگرام ہے؟"

وسیم ..... (مسکراتے ہوئے) "کل علی کی سالگرہ ہے۔"

نوین ..... "اچھا، تو تم اس کو فول بناؤ گے۔ پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

وسیم ..... "ٹھیک ہے..... تم بھی چلنا ویسے بھی علی کی برتھ ڈے پہ دعوت تو ہم تمام گھر والوں کو دی گئی ہے مگر صرف ہم دونوں ہی جاسکیں گے کیوں کہ امی ابو کو تو کل ایک شادی میں شرکت کرنی ہے۔"

نوین ..... (جھنجلا کر) "ہاں ہاں مجھے معلوم ہے۔ تم اپنے پروگرام کے بارے میں بتاؤ کہ علی کو تم کس طرح ڈرانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وسیم ..... "پروگرام تو بہت مزیدار اور دلچسپ ہے۔" (یہ کہہ کر وسیم نوین کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جاتا ہے اور آہستگی سے نوین کو اپنے پروگرام کی تفصیل بتانے لگتا ہے۔ پوری بات سن کر نوین کے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

(علی کے گھر میں ہر طرف چہل پہل تھی، ہر طرف مہمان کھڑے ہوئے تھے اور علی بہت بے چینی کے ساتھ وسیم کا انتظار کر رہا تھا کیوں کہ وسیم علی کا سب سے گہرا دوست تھا۔

علی بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ آٹھ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے اور ٹھیک آٹھ بجے علی کو کیک کاٹ کر تقریب کا آغاز کرنا تھا۔

ہر سیکنڈ بعد علی دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ آٹھ بجنے میں صرف تین منٹ باقی تھے کہ ایک دم وسیم کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے نوین کو دیکھ کر غوالہ خوش ہو جاتی ہے۔

علی ..... (وسیم سے ناراض ہوتے ہوئے) "تم نے اتنی دیر کیوں لگائی اور آنٹی اور انکل کہاں ہیں؟"

وسیم ..... "امی اور ابو کو تو ایک شادی اٹینڈ کرنی تھی اس لئے وہ نہیں آسکے اور اسی وجہ سے

مجھے اور نوین کو آنے میں دیر ہوگئی۔"

نوین ..... "اور یہ لیں علی بھائی اپنی سالگرہ کا تحفہ!"

(علی "شکریہ" کہتے ہوئے نوین کے ہاتھ سے تحفہ لے کر میز پہ رکھ دیتا ہے اور پھر پورے آٹھ بجے علی تالیوں کی گونج میں کیک کاٹ کر تقریب کا آغاز کرتا ہے۔ ٹھیک دس بجے کے قریب سالگرہ کی یہ تقریب اختتام پذیر ہوتی ہے تو تمام مہمانوں کے رخصت ہوجانے کے بعد غزالہ نوین اور وسیم کو روک لیتی ہے۔)

وسیم ..... "بھئی ہم تو خود ہی دیر سے گھر واپس جانے کا سوچ کر آئے تھے۔ آخر جلدی گھر جا کر کیا ہم دونوں مکھیاں مارتے؟"

نوین ..... (اپنی مسکراہٹ چھپا کر سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے) "اور پھر ہم نے یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ علی بھائی کو کیا کیا تحفے ملے ہیں۔"

غزالہ ..... (ہنستے ہوئے) "علی تم ان کے سامنے ہی تحائف کھولنا شروع کر دو تاکہ یہ بھی دیکھ لیں کہ تم کتنے مالدار ہوگئے ہو۔"

(علی مسکرا کر پہلے تو وسیم، نوین اور غزالہ پہ نظر ڈالتا ہے پھر تحائف کھول کھول کر دیکھنے لگتا ہے اور ان تحفوں کو دیکھ دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے۔ آخر میں جب علی وسیم اور نوین کا دیا ہوا پیکٹ کھول کر دیکھتا ہے تو اچانک اس کے ہاتھ سے ڈبہ چھوٹ کر گر جاتا ہے اور وہ چیخ مار کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

غزالہ ..... (حیرت زدہ انداز میں) "کیا ہوا؟"

علی ..... (ہکلاتے ہوئے) "وہ..... چھپ..... کلی"

نوین ..... (مسکراتے ہوئے) "علی بھائی یہ چھپ کلی کیا بلا ہے؟"

وسیم ..... (ہنستے ہوئے) "یار علی تم تو واقعی بہت ڈرپوک نکلے۔"

علی ..... "تت..... تو کیا یہ تمہاری شرارت ہے۔"

نوین ..... "دراصل بھائی جان نے پیکٹ کے اندر پلاسٹک کی چھپکلی رکھ دی تھی جسے علی بھائی آپ نے سچ مچ کی چھپکلی سمجھ لیا۔"

علی ..... (خفگی سے) "تم بہت بدتمیز ہو وسیم۔"

وسیم ..... (مسکرا کر علی کی طرف دیکھتے ہوئے) "اور تم بہت ڈرپوک ہو۔"

غزالہ ..... (ڈبہ اٹھاتے ہوئے) "ارے..... اس میں تو ایک اور ڈبہ موجود ہے..... یعنی کہ..... ڈبے میں ڈبہ!"

علی ..... "اس میں بھی کوئی چیز ہوگی مجھے ڈرانے کے لئے!!"

غزالہ ..... (پیکٹ علی کی طرف بڑھاتے ہوئے) "کھول کر تو دیکھو۔"

علی ..... "ہرگز نہیں، وسیم کو ہی دوبارہ کھولے گا۔"

نوین ..... "کھول کر دیکھ لیں علی بھائی، دیکھیں

اس میں سے کیا نکلتا ہے ببر شیر یا ہاتھی۔"

علی (منہ بنا کر) "اب میں اتنا بھی بے وقوف نہیں کہ یہ سمجھ لوں کہ اتنے بڑے بڑے جانور اس چھوٹے سے ڈبے میں سما جائیں گے۔"

(یہ کہہ کر علی غزالہ کے ہاتھ سے پیکٹ لے لیتا ہے اور ڈبہ کھولنے لگتا ہے۔ وسیم، نوین اور غزالہ علی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر بہت محفوظ ہوتے ہیں)

علی..... (حیران ہو کر) "ارے..... اس میں تو بہت قیمتی اور خوبصورت گھڑی ہے۔"

غزالہ ..... "شکر ہے کہ اس میں کچھ اور نہیں ہے۔"

(وسیم پلاسٹک کی چھپکلی اٹھا کر علی کے قریب لے جاتا ہے تو علی خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کرلیتا ہے)

وسیم..... (مسکرا کر) "ڈرپوک کہیں کے۔"

(غزالہ اور نوین کے قہقہے کمرے میں گونج اٹھتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

SOHRAB VIP sports

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan

Midas

اللہ بچائے ایسی پکنک سے

سید فیصل علی کاظمی

ہم سب بچوں کے بے حد اصرار پر آخر کار شاکر انکل ہمیں پکنک پر ٹھٹھہ لے جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ میرے علاوہ عاطف، کاشف اور راشدہ آنٹی کے بیٹے زبیر، عمیر اور شانی بھی ساتھ ہوگئے۔ روانگی سے پہلے انکل نے اپنی بند جیپ میں پیٹرول بھروایا۔ ہوا وغیرہ چیک کی۔ راستے اور پکنک پوائنٹ پر کھانے پینے کے لئے سامان لیا۔ ساتھ ہی عاطف نے اپنی سائیکل، کاشف نے ایک گیند اور بلا بھی لے لیا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ہوا کے دوش پر اڑے چلے جارہے تھے۔ انکل کی نئی جیپ فراٹے بھر رہی تھی۔ ہم سب بہت خوش تھے پہلی مرتبہ شہر سے دور پکنک پر جارہے تھے۔ کاشف اپنی توتلی زبان میں لطیفہ سنا رہے تھے۔ میں انکل کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ شہر کی پُرہجوم ٹریفک سے بچتے بچاتے آخر کار ہم شہری حدود سے باہر نکل آئے۔ ہنگامہ خیز زندگی سے پُرسکون ماحول کتنا سحر انگیز لگنے لگا تھا۔

سفر شروع کئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ راستہ کے گزر جانے کا احساس ہی نہیں ہو رہا

تھا۔ سڑک پکی ضرور تھی مگر برسوں سے مرمت طلب لگ رہی تھی۔ جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں کنارے ہریالی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ راستے میں کچھ گاؤں بھی نظر آئے۔ ہم لوگ جس طرف دیکھتے ایک نئی دنیا نظر آتی، جو ہم نے صرف کتابوں میں پڑھی تھی۔ یا ٹی وی ڈراموں میں دیکھی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی نہر..... بس دل چاہ رہا تھا بہتے پانی میں چھلانگ لگا دوں۔ انکل نے ایک جگہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے جھونپڑی نما ہوٹل کے سامنے جیپ روک دی۔ "آؤ بھئی! تم سب کو گاؤں کی چائے پلائیں۔" انکل جیپ سے اترتے ہوئے بولے۔ "انکل کیا یہ لوگ لال رنگ کی چائے پیتے ہیں۔" عاطف کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ "نہیں بھئی۔ بلکہ تم نے دیکھا ہوگا گھر پر جب تمہاری امی چائے بناتی ہیں تو پہلے پانی ابال کر پھر چائے کی پتی ڈالتی ہیں۔ مگر یہ لوگ دودھ میں چائے کی پتی ڈال کر چائے بناتے ہیں۔" انکل نے سب کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔ ہم نے ہوٹل میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر چائے پی۔ بغیر میز کرسیوں کے کتنا عجیب ہوٹل لگ رہا تھا۔ "واہ مزہ آگیا۔" زبیر نے چائے کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ انکل نے تھرماس میں بھی چائے بھروالی۔

آدھا گھنٹہ آرام کرنے کے بعد جیپ روانہ ہوگئی۔ آگے جاکر راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ یہاں شاید زیادہ ہی بارش ہوچکی تھی۔ زمین پر جگہ جگہ بھرا ہوا پانی اور آسمان پر کالے بادل مزید بارش کی گواہی دے رہے تھے۔ انکل کو یہاں جیپ آہستہ آہستہ چلانی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ کئی جگہ تو کافی پانی جمع ہوگیا تھا۔ میں نے تو کئی بار سوچا کہ انکل کو واپسی کا مشورہ دوں مگر جانے کیوں چپ رہا۔ آخر کافی آگے جاکر برساتی پانی ختم ہوگیا بس صرف زمین گیلی سی نظر آرہی تھی۔ انکل نے رفتار بڑھا دی مگر کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک دم جیپ کی رفتار خود بخود کم ہونا شروع ہوگئی۔ انکل نے رکتی ہوئی جیپ کو کنارے پر کر لیا۔ جیپ رک گئی۔ انکل نے مجھے دیکھا۔ "شاید پانی وغیرہ انجن میں چلا گیا ہے۔" میں اور انکل دونوں نیچے اترے۔ انکل نے جیپ کا ہڈ اٹھا کر انجن کو چیک کیا۔ پھر اس کا پوائنٹ اور پلگ دیکھا، ریڈی ایٹر کا پانی دیکھا۔ ہر چیز تو اپنی جگہ ٹھیک تھی۔

"انکل کچھ پتہ چلا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سب کچھ تو ٹھیک ہے پھر کیوں بند ہوگئی؟" انکل نے دوبارہ اس کو اسٹارٹ کرنا چاہا مگر وہ تو بے جان جسم کی طرح صرف تھر تھر کرتی اور خاموش ہو جاتی۔

انکل کو پسینہ آگیا۔ "خدا خیر کرے۔ یہاں تو کوئی گیراج بھی نہیں ہے۔"

"ایسا تو نہیں کہ پیٹرول ختم ہوگیا ہو؟" کیونکہ میں نے دیکھا کہ پیٹرول بتانے والی سوئی پیٹرول کے

ختم ہونے کا اشارہ دے رہی تھی۔ میں نے میٹر دیکھ لیا تھا۔

اب جو انکل نے پیٹرول کے ٹینک کے منہ کی طرف دیکھا تو ان کے منہ سے "اوہ" نکلا کیونکہ اس کے منہ پر لگا ڈھکنا غائب تھا۔ انہوں نے لوہے کی سلاخ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ٹینک تو واقعی خالی ہے۔ "اب کیا ہوگا؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ میں نے تو خود اس کو چابی لگا کر بند کیا تھا۔ انکل پریشان ہوگئے۔ بچے خاموشی سے سب کچھ دیکھ کر رہے تھے۔ اب جو انہوں نے سنا کہ پیٹرول ختم ہوگیا تو وہ بھی ایک ایک کر جیپ سے نیچے آگئے۔

عمیر نے انکل کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "انکل کیا اب گاڑی نہیں چلے گی۔ ہم اب گھر کیسے جائیں گے؟" عاطف نے اس کو بتایا۔ "عمیر اب ہم کو پیدل گھر جانا ہوگا۔"

"کیوں کیا یہاں بس نہیں چلتی؟" سب ہی پریشان ہوگئے۔ عمیر، زبیر اور کاشف تو رونے لگے۔ میں نے سب بچوں کو جیپ میں سوار کرا دیا۔ ان کو بسکٹ اور کچھ ٹافیاں دے دیں۔ "دیکھو فیصل تم جیپ میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ میں دیکھتا ہوں کہیں قریب سے پیٹرول یا امداد مل جائے۔" شاکر انکل پیٹرول کے لئے خالی ڈبہ لے کر آگے چل دیئے۔

میں نے جو گھڑی پر نظر ڈالی تو ۳ بج رہے تھے۔ آسمان پر بادل اور گہرے ہوگئے تھے۔ بچے بھی میری طرح سامنے گئے ہوئے انکل کی واپسی کا خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ ہم سب خاموش تھے۔ ان کے ہنستے ہوئے چہرے اداس ہوگئے تھے۔

اندھیرا بڑھ گیا اور پھر ایک دم بارش شروع ہوگئی۔ وہ بھی اتنی تیز کے دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔ اور ساتھ ہی ہوا میں خنکی بڑھ گئی۔ میں نے تھیلے سے چادر نکال کر ان سب کو اوڑھا دی۔ وہ سب کانپنے لگے تھے۔ بارش بھی خوب زوروں پر تھی۔ انکل کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ یوں تو اس سڑک پر ٹریفک کم ہی ہوتا ہے۔ مگر آج تو لگ رہا تھا جیسے اس سڑک پر کوئی گاڑی گزرتی ہی نہ ہو۔ بالکل ہُو کا عالم لگ رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوا کا شور مزید خوف زدہ کر رہا تھا۔

بارش تھم گئی مگر دور دور تک پانی ہی پانی ہوگیا۔ میں بھی بچوں کے ساتھ دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ تب انکل نے جیپ کے دروازے پر آواز لگائی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ انکل کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "بھئی یہاں تو دور دور تک کہیں نہ تو کوئی آبادی ہے اور نہ ہی پیٹرول۔ اب تو بس یہی دعا کرو کہ کوئی غیبی امداد مل جائے۔" وہ بھی اندر آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے گیلے کپڑوں کو دیکھا اور قمیص اتار دی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ ٹھنڈ سے وہ بھی کانپنے لگے۔ "انکل کیا اب ہم گھر بھی نہیں جاسکیں گے؟" شانی نے

روتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بیٹے ابھی یہاں بس آئے گی ہم سب اس میں بیٹھ کر جلدی گھر چلیں گے۔ تم لوگوں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟“ انکل نے مجھ کو اشارہ سے چائے کے لئے کہا۔ میں نے سب کو چائے اور بسکٹ دے دی۔ گھڑی سے معلوم ہوارات شروع ہوچکی۔ پانی تو اُتر گیا تھا مگر اونچی نیچی جگہ پر پانی کھڑا ہو گیا۔ میں اور انکل بار بار اللہ سے دعا کرنے لگے۔ انکل نے جیپ کی ہیڈ لائٹ جلا دی تھی کہ اگر کوئی دیکھے تو آجائے۔ بچے خوف کے مارے روتے رو۔تے سو گئے۔

دور سے آتی ہوئی کسی بڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں انکل اور میں جلدی سے جیپ سے اتر کر آنے والی گاڑی کو روکنے کے لے اشارہ کرنے لگے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے ہمیں دیکھ کر گاڑی روک لی۔ وہ ایک لوڈنگ ٹرک تھا۔

”کیا بات ہے؟“ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔

انکل نے ان کو ساری صورت حال بتائی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر کر آیا اور جیپ کی طرف چل دیا۔ ”آپ کو پیٹرول چیک کر کے چلنا چاہئے تھا۔“ وہ بولا۔ ”بس بھئی یہ ہماری بدقسمتی ہے نہ معلوم ایسا کیوں ہوا۔“

”خیر بابو جی آپ بچوں کو لیکر پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ہم تم کو قریبی گاؤں تک پہنچا دیتے ہیں۔ صبح کو وہاں سے شہر کو بس جاتی ہے آپ چلے جانا۔ ویسے بھی ایسے موسم میں آپ کو ادھر نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ انکل نے جلدی جلدی بچوں کو ٹرک پر سوار کیا۔ جیپ کے دروازوں کو لاک کیا۔ میں بچوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ انکل ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔

وہ دونوں گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا جس کا نام شمس اور دوسرا رفیق محمد تھا۔ وہ شہر سے گاؤں کی ضروریات کی چیزیں خرید کر لاتے اور کھیتوں میں پیدا ہونے والا اناج شہر لے جایا کرتے تھے۔ یہ مجھے بعد میں انکل نے بتایا تھا۔

خدا خدا کر کے گاؤں آیا۔ ٹرک رک گیا۔ انکل نے ہمیں نیچے اتارا۔ سڑک کے کنارے پر کوئی ٹرکوں کا اڈا تھا۔ ہر طرف ٹرک اور ایک دو بسیں بھی کھڑی نظر آرہی تھیں۔ ایک ویسا ہی ہوٹل بھی تھا۔ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف، خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے اندر چارپائیوں پر کافی لوگ سو رہے تھے۔

شمس نے ہوٹل میں جاکر پلنگ پر سونے والے کو آواز دی ”غلام محمد، او غلام محمد“ غلام محمد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شمس نے گاؤں کی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے ہمیں دیکھا پھر ہوٹل کے برابر بنے ہوئے کمرے کے دروازے کا تالا کھولا۔ شمس نے انکل سے کہا۔ ”جاؤ بابو۔

بچوں کو اندر لے جا کر آرام کرو۔ صبح میں تم کو شہر کی بس میں سوار کرا دوں گا۔"

انکل اور ہم سب اندر آ گئے۔ اندر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ انکل نے سب بچوں کو لٹا کر ان کو چادر اوڑھا دی۔ کمرے میں ایک مٹکا، اس پر مٹی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ انکل نے پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس سنسان راستہ سے تو یہ پناہ گاہ زیادہ محفوظ تھی۔ جانے وہاں اکیلے ہم سب پر کیا گزرتی۔

تھوڑی دیر بعد شمس ایک چائے کی کیتلی اور کچھ پاپے لے کر آیا۔

"لو بابو اس وقت تو یہ ہی مل سکا۔ بچوں کو کھلا دو، پتہ نہیں کب سے بھوکے ہوں گے۔"

وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ دوپہر کے بعد کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ انکل اور شمس، غلام محمد کی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے پھر انکل کمرے میں آ گئے۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور لیٹ گئے۔ سارے دن کی پریشانی سے وہ بھی بہت تھک چکے تھے۔ لیٹنے کو تو لیٹ گئے مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے کروٹ لی اور بولے۔

"فیصل یہ گاؤں کے لوگ بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ بہت مہمان نواز۔ تم کو بتاتا ہوں کہ جب ہم پاکستان آئے تھے۔ اس وقت میں تم سے کچھ چھوٹا ہوں گا۔ مگر مجھے آج بھی یاد ہے جب لٹے پٹے قافلے ٹرینوں سے اتر رہے تھے تو یہ ہی لوگ تھے جنہوں نے ان بے سرو سامان مسافروں کو رہنے کے لئے گھر، کھانا اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے دیئے۔ ان کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔ یہ جو آج تم ہجرت کر کے آنے والوں کو دیکھ رہے ہو یہ اُن کی خوشحالی بھی اِن کی محبت، اخوت اور مہمان نوازی کی زندہ مثال ہے۔" میں اور انکل باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

صبح سویرے شمس نے آ کر ہمیں جگایا۔ "بابو جی شہر جانے والی بس تیار کھڑی ہے آپ اس میں سوار ہو جایئے۔" انکل نے جلدی جلدی بچوں کو اٹھایا۔ سب بس میں بیٹھ گئے۔ شمس نے بس کے ڈرائیور کو اپنی زبان میں کچھ سمجھایا۔ پھر انکل سے بولا۔ "بابو جی راستے میں اپنی جیپ دیکھ لینا۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے وہ پیٹرول دے دے گا۔ تاکہ آپ اپنی جیپ بھی لے جا سکو۔"

انکل نے کچھ رقم نکال کر شمس کو دینا چاہا تو اس نے بڑے غصہ سے کہا "بابو جی کیوں ہماری بے عزتی کرتے ہو۔ ارے مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ اس کو جیب میں رکھو۔ ہمیں رقم کی نہیں، محبت کرنے والوں کی ضرورت ہے۔"

انکل بھی شرمندہ ہو گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کو گلے لگایا۔ پھر جیب سے نکال کر اپنا کارڈ دیا۔" دیکھو شمس میری بھی تم سے یہ درخواست ہے کہ جب شہر آؤ مجھے بھی اپنی میزبانی کا شرف بخشنا تمہارا مصیبت کے وقت ہماری مدد کرنا ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے بابو جی۔ ہم ضرور آئیں گے۔ یہ میرے دوست غلام محمد کو شہر دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔" اس نے غلام محمد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چلو بابو جی اب بس میں سوار ہو جاؤ۔" "دیکھو تم دونوں ضرور ضرور آنا۔" ڈرائیور کی آواز پر انکل نے ان سے ہاتھ ملایا۔ "دیکھو بھولنا نہیں۔"

بس روانہ ہوگئی۔ رات کو پھر بارش نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر بھرا پانی بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اور ہم سب کے چہروں کی اداسی بھی کم ہوگئی تھی۔ جب بس ایک جگہ رکی تو انکل نے اتر کر بس ڈرائیور سے پیٹرول لیا۔ وہ خود بھی بس سے اتر آیا جیپ میں پیٹرول ڈالا۔ وہ بولا۔ "بابو جی آپ آتے ہوئے مہر گاؤں کے ہوٹل پر تو نہیں رکے تھے۔؟" "ہاں رکا تو تھا۔" انکل بولے۔

"بس بابو جی۔ آپ کی جیپ کا پیٹرول ان ہی لوگوں نے چرا لیا ہوگا۔ کیونکہ اکثر وہاں پر رکنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ وہاں کے آوارہ گرد گاڑیوں کا پیٹرول چرا کر بیچ دیتے ہیں۔"

تب انکل کو یاد آیا انہوں نے اپنی جیپ ہوٹل کے سامنے کھڑی کرنے کے بجائے آگے لے کر جا کر کھڑی کی تھی۔ تب ہی ایسا ہوا ہوگا۔ اور کسی نے چپ چاپ پیٹرول نکال لیا ہوگا۔ انکل نے جیپ میں پیٹرول بھر کر اس کے منہ پر کپڑا ٹھونس دیا۔ جیپ اسٹاٹ کی تو وہ جاگ اٹھی۔ انکل نے بچوں کو بھی بس سے اتار لیا۔ بس ڈرائیور کو پیٹرول کی قیمت کے علاوہ انکل نے سو روپیہ زیادہ دیئے۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ اور ہم سب خیریت سے گھر واپس پہنچ گئے۔ جہاں سب پریشان حال بیٹھے ہوئے تھے۔ دادی اماں نے تو رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ راشدہ آنٹی کو بخار ہو گیا تھا۔ میری امی تو تمام رات مصلّے پر بیٹھی رہیں اس واقعہ کو گزرے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ شمس اور غلام محمد ہمارے گھر کے کئی چکر لگا چکے ہیں۔ اور آج وہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کو شہر دکھانے آیا ہوا ہے۔ اس کے بچوں کو دیکھ کر مجھے وہ پکنک یاد آگئی۔ اللہ بچائے ایسی پکنک سے!

بخدمت جناب

"بخدمت جناب" میں آئندہ سے ہم کسی ایک خط کو ذرا تفصیل سے شائع کیا کریں گے جس میں نئی نسل کے کسی اہم مسئلے کی نشاندہی کی گئی ہوگی۔ قارئین آنکھ مچولی چاہیں تو "ایک خط ایک مسئلہ" کے عنوان سے ہمیں ایسے خطوط لکھ سکتے ہیں۔ (ادارہ)

رفعت ناصر خان، نارتھ کراچی۔

ایجادات نمبر پڑھ کر دل خوشی سے اچھل پڑا۔ ہم نے جیسے ہی اس کو پکڑنے کی کوشش کی گم ہو گیا.....؟ دل تو آنکھ مچولی میں گم ہو گیا ہے۔ اتنا اچھا اور معلوماتی رسالہ شائع کرنے پر ہماری طرف سے آنکھ مچولی کو دلی مبارک ہو۔

راشد منہاس ثاقب، برج کالاں۔

ایجادات نمبر بے حد پسند آیا۔ اب تک میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی ہے کہ کس کہانی کو اوّل نمبر قرار دوں مگر یہ تو پورے کا پورا رسالہ ہی اوّل نمبر ہے۔

افشین اسعد، کراچی۔

انکل آپ سے مجھے ایک سوال پوچھنا تھا وہ یہ کہ اتنا بہترین "ایجادات نمبر" آپ نے کیسے شائع کر لیا۔ واقعی سب کچھ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسالے کی کس کہانی کی تعریف کروں "تاریخ کے دریچے" سے لے کر قلم قتلے تک سب ہی بہترین ہے اور ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔

نواب علی پریمی (؟)

آنکھ مچولی ایجادات نمبر پڑھا۔ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن آپ کے رسالے سے ایک شکایت ہے آپ کا رسالہ کہانیوں لطیفوں اور نظموں وغیرہ میں اچھا ہے مگر انعامی سلسلوں میں انعام کی تعداد کم ہے۔ کم از کم ایک انعامی مقابلے میں چار یا پانچ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی ہو۔

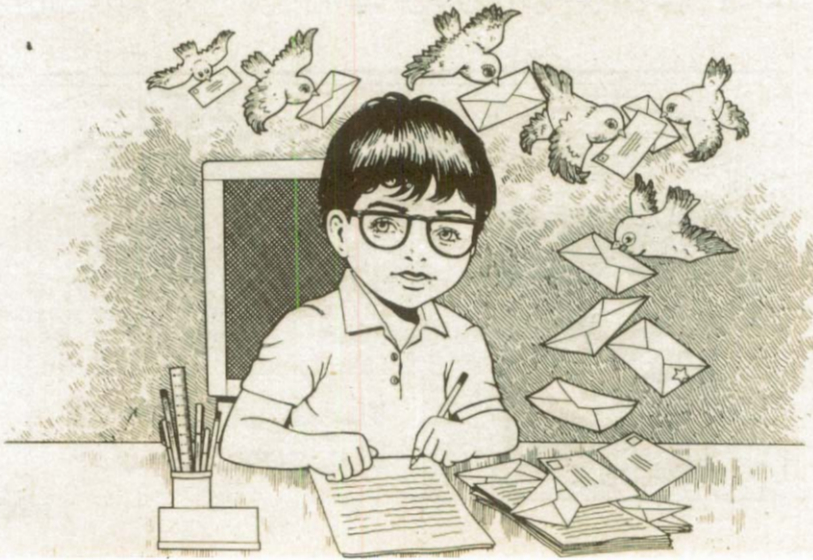

(ایک خط ایک مسئلہ)

جناب مدیر
السلام علیکم!

نئے سال کا تحفہ "ایجادات نمبر ملا۔ سب سے پہلے آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "ایسا لگتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی مغرب اور وہ بھی غیر مسلموں کی میراث ہو کر رہ گئی ہے۔" آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ لیکن اس کی وجوہ بھی ہیں شروع ہی سے ہمیں سائنس سے دور رکھا جاتا ہے۔ اسکولوں میں، خاص طور پر جو گورنمنٹ کے ہوتے ہیں اور جن میں عام آدمی کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیبارٹری اور لائبریری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو اس پر ٹیچروں کا قبضہ ہوتا ہے۔ کتابیں صرف اور صرف ٹیچروں کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں۔ لیبارٹری میں سامان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اگر ہوتی ہے تو سامان اتنا پرانا ہوتا ہے کہ استعمال کے قابل نہیں ہوتا۔ طالب علموں کو دہم سے پہلے لیبارٹری میں جانے نہیں دیتے۔ یہ تو رہی اسکولوں کی حالت۔ ہمارے کالج (خاص طور پر لاہور کے) صرف نام کے کالج ہیں۔ میں خود ایک کالج کا طالب علم ہوں۔ ہمارے کالج میں کیمسٹری کی لیب میں سامان ٹوٹا پھوٹا ہے۔ ایک ایک اپریٹس پر پانچ پانچ لڑکے کام کرتے ہیں۔ فزکس کی لیب تو اس سے بھی گئی گزری ہے۔ اسٹاپ واچ تو اس وقت ملتی ہے ہیں جب نئی نئی گھڑی ایجاد ہوئی تھی۔ آلات وغیرہ کو زنگ لگا ہوتا ہے بیٹریز اس وقت ہی دکھائی دیتی ہیں جب بجلی دریافت ہوئی تھی۔ الغرض شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جو درست کام کرتی ہو۔ ایسی صورت میں ہم کیسے ترقی کریں گے۔ ہم ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کیونکر شامل ہوں گے۔ ہماری نئی نسل جدید علوم سے کیسے واقف ہوگی۔ اور ہم میں سائنس دان کیسے پیدا ہوں گے۔

انجم جاوید، لاہور

شہزادہ التمش، فیصل ٹاؤن، لاہور۔

"ایجادات نمبر" میں کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ پڑھ کر دل چاہا کہ اگلے مہینے کا شمارہ بھی ابھی مل جائے۔ "آنکھ مچولی" جیسا رسالہ شاید ہی کوئی اور ہو۔

اشعر نواز، چاچڑاں شریف۔

ایجادات نمبر بہت اچھا تھا۔ پڑھ کر بہت مزا آیا اور ہماری معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ مضامین میں "ایڈیسن کی باتیں" "قاتل یا مسیحا" "پرواز کی خواہش" اور کہانیوں میں "روگا" بہت اچھی تھی۔ نظم "نیا سال" بہت اچھی تھی۔ انکل! ایجادات نمبر ہمارے لئے سال کا بہترین تحفہ ثابت ہوا۔

زاہد قریشی، چترپڑی۔ آزاد کشمیر

"ایجادات نمبر" خریدا۔ پانچ چھ منٹ سرورق دیکھنے میں ہی لگ گئے۔ سرورق دیکھ کر "حیرت ناک نمبر" کی یاد تازہ ہو گئی۔ اتنی شاندار تصویر سرورق پر شائع کرنے پر میری طرف سے "آنکھ مچولی" کو مبارک باد۔ اور اتنا اچھا نمبر شائع کرنے پر بھی مبارک باد۔ "ایجادات نمبر" کا اداریہ ہم سب مسلمانوں کے لئے بہت ہی فکر انگیز تھا۔ "ایجادات نمبر" کے تمام مضامین مجھے بہت زیادہ پسند آئے۔ (میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں)۔ واقعی ایجادات اور سائنس کے موضوع پر اگر دو اور بھی نمبر آئیں تو پھر بھی کم ہیں۔

ذیشان احمد، کھاریاں چھاؤنی۔

"ایجادات نمبر" ہر لحاظ سے پسند آیا۔ لطیفے کوئی خاص نہ تھے۔ البتہ باقی آنکھ مچولی بہت پسند آیا۔ آپ آئندہ "مزاحیہ نمبر" نکالیں۔

سلمان احمد، کھاریاں چھاؤنی۔

ایجادات نمبر اپنے معیار پر پورا اترا۔ لطیفے بھی پسند آئے۔ کہانیوں کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ سرورق بھی اچھا تھا۔

سیما اسحاق، کراچی۔

"ایجادات نمبر" آپ کی ایک مفید ایجاد ثابت ہوا۔ خلاف توقع "۳۰ دسمبر" کو ہی مل گیا۔ شکریہ جی شکریہ۔ جناب ابھی تو شکایات نمبر بھی نکالنا ہے۔ چلیں تیاری شروع کر دیجئے جلدی سے ..... ہاں اور اب یہ "ساتھی بچپن کے" ختم بھی کریں نا ..... بہت بور کرتا ہے یہ سلسلہ۔

یاسمین رحمت، ساہیوال۔

صرف ایک بات کی خوشی ہے کہ ٹائٹل اس بار شاندار ہے۔ ہمیشہ ایسے ہی ٹائٹل دیا کیجئے۔ حیرت ناک۔ پراسرار قسم کے۔ مگر ایک شکایت ہے۔ آپ ٹائٹل کا عنوان نہیں دیتے ہیں۔ اس سے الجھن سی ہو جاتی ہے۔

عبدالرزاق، ملتان۔

سال نو اور آنکھ مچولی کے "ایجادات نمبر" کی کامیابی پر مبارک باد قبول کریں۔ یہ سب آپ کی اور لکھنے والے ساتھیوں کی محنت کا ثمر ہے اس شمارے سے میرے علم میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مشہور مسلم سائنس دانوں کا ویو فائنڈر بہت ہی لاجواب تھا لیکن اس میں مسلمان سائنسدانوں کے سن غلط لکھے ہوئے ہیں۔ سرورق بھی بہت قابل دید تھا۔ میں نے اس معیار کا رسالہ نہ دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔

○ ..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ غلطیوں کی وضاحت بھی کر دیتے۔

برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔

جنوری کا "ایجادات نمبر" ملا۔ اور ساتھ میں تحفہ بھی میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ "اسلامی ادب نمبر" نکالئے اور ساتھ میں حمد اور نعت کی ایک چھوٹی سی کتاب بھی بطور تحفہ دیجئے گا۔ ○ ..... بھئی آپ لوگ سانس تو لینے دیا کیجئے یہ ایک نمبر سے فارغ ہوتے ہی اگلے نمبر کا مطالبہ شروع ہو جاتا ہے۔

ساجدہ بتول، کراچی۔

میں ایک مدت سے آنکھ مچولی پڑھتی رہی ہوں۔ لیکن اچانک بڑی جماعتوں میں آکر یہ سلسلہ چھوٹ گیا۔ بہرحال اس سال کے آغاز پر میں نے اپنے پیارے رسالے کو دوبارہ پالیا ہے۔ اور بہت خوش ہوں۔

"ایجادات نمبر" شائع کرنے پر دلی مبارک باد۔

اسما اصغر، راولپنڈی۔

"ایجادات نمبر" توقعات سے بڑھ کر مفید ثابت ہوا۔ یہ واقعی ایک اچھوتی کاوش تھی (خوش ہو جائیں) "محمد عمر خان" کی تحقیق "غار میں خزانہ" میں انہوں نے لکھا کہ "پولینڈ کے ایک پروفیسر کے گھر ایک بچی ہوئی جس کا نام انہوں نے کیوری رکھا۔" حقیقتاً مادام کیوری کا نام ان کے والدین نے "مانیا سلوڈوسکا" رکھا تھا جو انہوں نے پیرس جانے کے بعد خود ہی تبدیل کر کے "میری" رکھ لیا۔ مادام کیوری ان کو کے شوہر "پیر کیوری" کی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔

محمد شکیل بھٹو، دادو۔

"ایجادت نمبر" پڑھا۔ بہت ہی اچھا ہے۔ میری طرف سے تمام ادارہ کو مبارک باد۔ البتہ "ایجادات نمبر" میں تمام لطائف نقل شدہ تھے۔

شہزاد حیدر خان، چیچہ وطنی۔

ایجادات نمبر پڑھا۔ یقین کریں رسالہ شروع کرنے کے بعد جب تک مکمل رسالہ ختم نہیں ہوا اس وقت تک چین ہی نہیں آیا۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

○ ..... شکریہ۔

زاہدہ رحمت، ساہیوال۔

"ایجادات نمبر" مل گیا خوشی خوشی رسالہ لیا اور اسی وقت ہماری ساری خوشی خاک میں مل گئی جب ہم نے دیکھا کہ نہ ہمارا خط چھپا ہے اور نہ جوابات۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب تک تحریریں بھیجتی رہوں گی؟

اس وقت تک جب آپ کی تحریر چھپ جائے۔

جنوری کے شمارے میں اسلام آباد کی نائمہ احمد کا خط شائع ہوا تھا جس میں انہوں سائنسی نمائش میں چند بد تمیز لڑکوں کا حال بیان کیا تھا۔ اس خط کی اشاعت کے بعد ہمیں بے شمار قارئین کے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں سے چند خطوں سے اقتباس شائع کئے جا رہے ہیں۔

نسرین بی بی، دریا آباد کراچی

نائمہ احمد نے جس مسئلے کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری یہ تجویز ہے کہ جب بھی کبھی کسی نمائش میں شرکت کرنی ہو تو اس نمائش کے بارے میں پہلے سے معلومات اکٹھی کر لینی چاہئیں۔ آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ نمائش میں خواتین کے لئے دن مقرر کیا جاتا ہے۔ اس دن صرف خواتین اور لڑکیاں نمائش میں جاتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم لڑکیاں یا خواتین خود ہی ان لڑکوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات پر عمل کریں اور باپردہ رہ کر اپنی تعلیم اور ہنر سیکھیں تو ہمارا معاشرہ سُدھر سکتا ہے۔

ایک مخلص پاکستانی

نائمہ احمد کا خط پڑھا۔ کافی افسوس ہوا کہ ہماری نوجوان نسل جس سے قوم کی توقعات وابستہ ہیں، کس ڈگر پر چل نکلی ہے۔ مگر دیکھا جائے تو اس میں لڑکیوں کا بھی قصور ہے۔ اگر وہ اسلام کے حکم کے مطابق پردہ کر کے باہر نکلیں تو کسی بدمعاش کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ انہیں چھیڑیں۔

محمد امیر خان، بلدیہ ٹاؤن، کراچی۔

بہن "نائمہ احمد" سے عرض ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ حال ہی میں بلدیہ ٹاؤن کے علاقے میں بھی ایک سائنسی میلہ لگایا گیا۔ ہم نے بھی اپنے اسکول کی جانب سے ایک پروجیکٹ پیش کیا۔ اس نمائش میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آج کوئی سائنسی نمائش نہیں بلکہ لڑکیوں کی بناؤ سنگھار کی نمائش ہو رہی ہے۔ کیا لڑکیاں پردے میں رہنا پسند نہیں کر سکتیں؟

ایک محبِ وطن

جنوری کے رسالے میں ایک بہن کا خط پڑھا افسوس ہوا۔ اس نمائش میں، میں بھی گیا تھا۔ میرے کالج کے لائق لڑکوں کو کالج والوں نے خود بھیجا تھا۔ مگر کچھ بدصفت اور نالائق اپنی موٹر سائیکلوں اور کاروں میں ساتھ ہولئے۔ میری تشویش کے باوجود انہیں کسی نے نہ روکا بلکہ مجھے کہا کہ اگر تم جا رہے ہو تو دوسروں کو کیوں روکتے ہو حالانکہ مجھے کالج نے بھیجا تھا۔ خیر وہ وہاں گئے اور جو حالات بہن نے بتائے ہیں، خود میں نے دیکھے اگر میں بولتا بھی تو طوطی کی آواز نقار خانے میں کوئی نہ سنتا بلکہ مجھے "پڑھاکو" "کتابی کیڑا" کے القاب سے نوازا جاتا۔ میرے تجزیئے کے مطابق قصور صرف لڑکوں کا نہیں بلکہ (اگر آپ اجازت دیں تو) میں کہوں گا کہ (حوصلہ افزائی) کے بغیر لڑکے کچھ نہیں کر سکتے اگر لڑکیاں اپنی اساتذہ کو (جو یقیناً ان کے ساتھ ہوں گی) بتا دیتیں اور وہ لڑکوں کے اساتذہ سے شکایت کر دیتیں تو ایسی بے بسی کی حالت نظر نہ آتی کہ لڑکیاں پریشان ہوں یا روئیں، بلکہ الٹا اس سے مثال قائم ہوتی اور میرا یقین ہے کہ اگر ہمارے پرنسپل کو کسی ایسے واقعہ کا علم ہوتا تو وہ ایسے لڑکوں کی خوب "تواضع" کرتے اور انہیں کالج سے "دھوم دھام" سے رخصت کر دیتے۔ ○ ..... آپ نے نمائش میں موجود ہو کر کچھ نہ کیا..... آپ میں ہمت کی کمی تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اب بھی آپ نے یہ خط گمنام بھیجا ہے۔

کنول صائمہ، مظفر گڑھ۔

نائمہ احمد کا خط پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ ہمارے معاشرے میں یہ فساد بہت زیادہ پھیل گیا ہے۔ ہم مظفر گڑھ جیسے چھوٹے شہر میں ایسی مشکلات کا مقابلہ کرتے آ رہے ہیں۔ اس کی جڑ وہ انڈین فلمیں ہیں جنہیں ساری رات جاگ جاگ کر ہماری نوجوان نسل دیکھتی ہے۔

تعلیم اور کھیل

عامر ظفر شیخ

نہیں تعلیم کی اب قدر و قیمت کھیل کے آگے
کوئی بے کار سا انجن ہو جیسے ریل کے آگے

رسائی کھیل کو حاصل ہوئی سارے جوانوں تک
کتابیں ہو گئیں محدود الماری کے خانوں تک

جو ہیں اَن پڑھ کھلاڑی ان پہ دنیا نے نظر کی ہے
سَند جن کو ملی ہے ان کی قسمت میں کلرکی ہے

بڑے کہتے نہیں اب نوجوانوں سے "پڑھو بیٹا"
وہ فرماتے ہیں ان سے "کھیل میں آگے رہو بیٹا"

کتابوں سے کوئی اب استفادہ ہی نہیں کرتا
کوئی اب "چین" جانے کا ارادہ نہیں کرتا

کھلاڑی کھیلنے کے واسطے اب چین جاتے ہیں
ہوا میں جس طرح اڑتے ہوئے شاہین جاتے ہیں

اگر اقبالؔ اور حالیؔ بھی ہوتے اس زمانے میں
مشقّت کر رہے ہوتے یہاں وہ رن بنانے میں

وہ دن بھی آ رہے ہیں جب مدارس کم سے کم ہوں گے
جہاں کالج کی بلڈنگ ہے وہاں اسٹیڈیم ہوں گے

پڑے گی اہلِ دانش کو ضرورت گیند بلّے کی
کتابوں کی جگہ ہوگی حکایت گیند بلّے کی

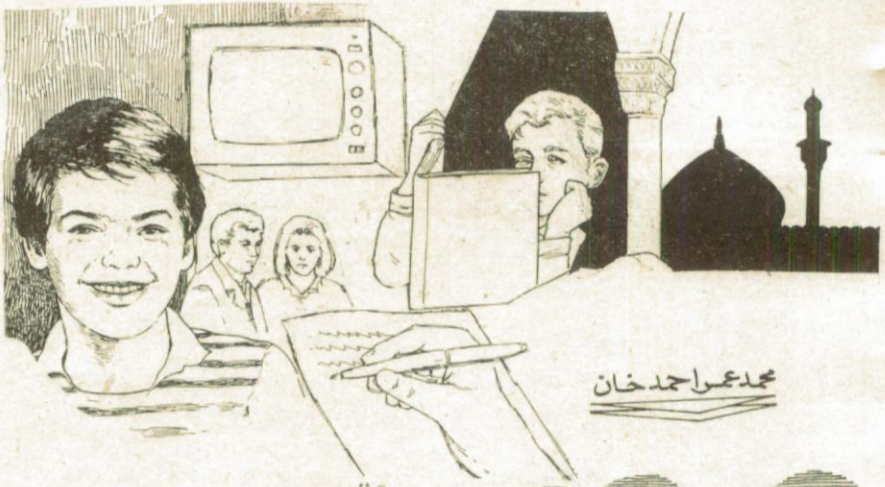

محمد عمر احمد خان

آپ بہت اچھے ہیں

ڈرائنگ روم کی آرام دہ کرسی کے اندر دھنسا اطہر آنکھیں بند کئے ملّی نغمہ سن رہا تھا۔

دل دل پاکستان جاں جاں پاکستان

کھٹ کی آواز آئی اور ٹیپ ریکارڈ بند ہو گیا۔

اطہر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، اطہر کو بھائی جان کے اس طرح ٹیپ بند کرنے پر بہت غصہ آیا۔

"مُنّے میاں! کیا بات ہے؟ آج کل آپ بڑے گانے شانے سننے لگے ہیں۔ خیر تو ہے؟"

بھائی جان نے اطہر کے بال بگاڑتے ہوئے مسخرے پن سے کہا۔

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں "گانے شانے" نہیں سنتا، صرف پاکستان کے قومی نغمے سنتا ہوں۔ آپ کی طرح تو نہیں۔ آپ تو ہروقت انڈیا کے گانے سنتے رہتے ہیں۔"

اطہر نے سنجیدگی سے کہا تو بھائی جان مُسکرا کر بولے۔

"مُنّے میاں! ہمیں معلوم ہے آپ سچے پاکستانی ہیں لیکن چھوٹے موٹے پاکستانی تو ہم بھی ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے آپ کتنے پاکستانی ہیں سال میں ایک بار تو آپ شلوار قمیص پہنتے ہیں اور وہ بھی عید کے دن۔"

اطہر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بھائی جان گنگنانے لگے۔

"میرا جوتا ہے جاپانی
یہ پتلون انگلستانی
سر پہ لال ٹوپی روسی
پھر بھی دل ہے پاکستانی"

"بالکل جھوٹ! سفید جھوٹ!! یہ گیت پاکستان کا ہے ہی نہیں۔"

اطہر چلایا تو بھائی جان اطہر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے:

"مُنّے یار! تجھ سے جیتنا واقعی مشکل کام ہے.....!!!"

اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ بجنے لگا۔

اطہر نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بھائی جان کے چار پانچ دوست قہقہے لگاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ اطہر ڈرائنگ روم سے جانے لگا تو بھائی جان نے آواز لگائی، "مُنّے میاں! آپا کو ذرا چائے کا کہہ دینا۔" آپا کو چائے کا کہہ کر اطہر اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اسے بھائی جان کے بن بلائے دوستوں پر سخت غصہ آرہا تھا جن کی وجہ سے وہ اپنی پسندیدہ کیسٹ بھی نہیں سُن سکا تھا۔

یکایک مٹر پلاؤ کی خوشبو اطہر کی ناک میں گھس کر اس کی بھوک تیز کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بڑی آپا نے اسے کھانے کے لئے پکارا لیکن ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ اطہر نے سوچا پہلے نماز پڑھ لوں۔ چناں چہ وہ مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ جیسے ہی مُڑا، مولوی صاحب نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ "میاں اطہر! ایک کام تو کرو۔ مسجد کے صحن میں کافی دُھول گرد جمع ہو گئی ہے۔ جھاڑو لے کر ذرا صفائی تو کر لو۔"

مسجد کی صفائی عموماً مؤذن صاحب پابندی سے کرتے لیکن آج ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ صحن کی صفائی کرنے کے بعد اطہر نے مؤذن صاحب کو بازار سے ڈبل روٹی لا کر دی۔ مؤذن صاحب نے اطہر کا شکریہ ادا کیا۔ اطہر کو اب بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ آج تو گھر میں اس کی پسندیدہ ڈش پکی ہے۔ "مٹر پلاؤ" کا خیال آتے ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔

"آپا! کھانا تو نکال دیں۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے!!" تولئے سے گیلے ہاتھ پونچھ کر اطہر دسترخوان پر بیٹھا اور جب اس نے کھانے پر نظر دوڑائی تو مٹر پلاؤ اسے کہیں بھی نظر نہ آئے۔

"آپا! مٹر چاول کہاں ہیں؟"

"وہ تو ختم ہو گئے!!"

"ختم ہو گئے؟!!"

"ہاں آپا شنّو اور ان کے بچے آگئے تھے۔ میں نے آپ کے لئے آلو کی بھجیا بنا دی ہے۔ اب آپ اسی پر گزارا

کیجئے.....!!!"

آلو کی بھجیا اچھی پکی تھی لیکن اطہر کو مزہ نہیں آرہا تھا۔ اسے تو مٹر چاول یاد آرہے تھے۔

شام پانچ بجے اس کا کرکٹ میچ تھا۔ اطہر نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ۴ بج رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی سفید جوڑے پر استری کی تاکہ میچ کے لئے پہن سکے۔ ابھی استری سے فارغ ہی ہوا تھا کہ آپا کی کچھ **سہیلیاں**.....آگئیں اور آپا نے اسے پیسے دے کر کھانے پینے کا سامان خریدنے بازار بھیج دیا۔

اطہر سامان خرید کر بھاگم بھاگ گھر پہنچا تو پورے پانچ بج چکے تھے۔ اس نے جلدی سے آپا کو کھانے پینے کا سامان پکڑایا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگا تاکہ کٹ کے کپڑے پہن کر میچ کھیلنے جاسکے لیکن یہ کیا اس کے استری کئے ہوئے کپڑے مطلوبہ جگہ سے غائب تھے۔ اطہر کو میدان میں پہنچنے کی جلدی ہورہی تھی۔ اس نے آپا سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ گڈو کا بھی میچ تھا اور وہ اس کا سفید استری کیا ہوا جوڑا پہن کر میچ کھیلنے چلا گیا ہے۔!!

"افوہ.....!!!" اطہر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اپنے کمرے میں آکر اطہر بے چینی اور غصے کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ گھر آیا تو گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اطہر نے امی جان سے پوچھا تو امی نے بتایا کہ سب لوگ دعوت میں گئے ہیں۔ اطہر کو یاد آیا کہ آج خالہ جان کے ہاں پورے گھر کی دعوت ہے۔ چھوٹی گڑیا کا عقیقہ تھا۔ "امی جان! آپ نہیں گئیں؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم چلے جاؤ۔"

"نہیں میں بھی نہیں جارہا۔" اطہر نے کہا اور گھر میں خاموشی دیکھ کر اس نے سوچا کہ ڈرائنگ روم میں جاکر دل دل پاکستان والی کیسٹ ہی سن لی جائے لیکن ڈرائنگ روم سے نغمے کی کیسٹ غائب تھی۔ اطہر نے امی جان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ جب وہ نماز پڑھنے گیا تھا تو اُسامہ آیا تھا۔ وہ اپنی کیسٹ واپس لے گیا ہے۔

"افوہ! یہ اُسامہ بھی بڑا بے صبرا ہے.....!!!" اطہر نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مُکا مارتے ہوئے غصہ سے کہا۔

سات بجے ٹی وی پر "ریسلنگ" آنی تھی۔ ریسلنگ اس کا پسندیدہ پروگرام تھا۔ اطہر جم کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ پہلے سات بجے۔ پھر سوا سات اور پھر ساڑھے سات، لیکن ریسلنگ شروع ہی نہ ہوئی۔ آٹھ بجے تک ٹیبل ٹینس کا میچ آتا رہا اور پھر آٹھ بج کر پانچ منٹ پر ڈرامہ شروع ہوگیا۔ ٹی وی والوں نے ریسلنگ نہ دکھانے کی کوئی وجہ بیان بھی نہیں کی۔

رات جب اطہر بستر پر سونے لیٹا تو دن بھر کے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے کسی فلم کی ریل کی طرح گزرنے لگے۔ "میرا آج کا دن کتنا بُرا

گزرا، شاید یہ میری زندگی کا سب سے تلخ اور بے کار دن تھا۔ اللہ میاں! آپ کی عبادت کرتا ہوں لیکن آپ نے آج کے دن میری کوئی مدد نہیں کی۔ جائیے! میں آپ سے ناراض ہوں۔" اطہر نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا اور پھر بہت سارے آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ روتے روتے رات کے نہ جانے کون سے حصے میں اس کا آنکھ لگ گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج مشرق سے اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ پیڑوں پر چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اطہر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ ساڑھے سات بج چکے تھے۔

"افوہ! آج تو اسکول کو دیر ہو جائے گی!!!"

اچانک اسے یاد آیا کہ آج تو حساب کی کاپیوں کی چیکنگ کا دن ہے اور میں نے حساب کا کام بھی نہیں کیا۔ کل مجھے یاد ہی نہ رہا۔

وسیم سر کاپیوں کی چیکنگ پہلے ہی پریڈ میں کرتے تھے۔ اطہر سوچنے لگا آج وہ پٹائی سے بچ نہیں سکے گا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے پٹنے کا خوف نہیں تھا، رونا اس بات پر آرہا تھا کہ سب لڑکوں کے سامنے بے عزتی ہوگی۔ سر کام چور اور نالائق ہونے کا طعنہ دیں گے۔

اطہر مسہری پہ بیٹھا، فکر مند چہرہ بنائے بے عزتی کے خیال سے ہول ہی رہا تھا کہ آپا کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا اسکول جانے کی تیاری کر رہے ہو؟" آپا نے پوچھا تو اطہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپا نے کہا۔ "آج عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی برسی ہے اور سارے اسکولوں کی چھٹی ہے۔ اس لئے تمہارا اسکول جانا بے کار ہے۔"

"اوہ میری پیاری آپا!!" اطہر جوتے پھینک کر آپا کے گلے سے لپٹ گیا۔

وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُسامہ آگیا۔

"اطہر! اطہر.....!! کہاں ہو تم؟"

"میں یہاں ہوں! پودوں کو پانی دے رہا ہوں۔" اطہر نے چلا کر کہا اور اُسامہ اس کے پاس چلا آیا۔ "یہ لو اپنی کیسٹ ماموں جان نے منگوائی تھی۔ انہوں نے سن لی ہے اس لئے اب لے آیا ہوں۔"

اطہر نے پانی کا پائپ بند کیا اور اُسامہ سے کیسٹ لے لی۔ "تھینک یو!"

اُسامہ چلا گیا تو اطہر پائپ لپیٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

گیارہ بجے دوپہر ڈاکیا اپنے ساتھ ایک عدد پیکٹ لے کر آیا جو اطہر کے نام تھا۔ اطہر نے پیکٹ کھولا تو اس میں اس کا پسندیدہ رسالہ جگمگا رہا تھا اور پھر جب اطہر نے رسالے کا مطالعہ شروع کیا تو اسے

یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کا بھیجا ہوا، مضمون رسالے میں چھپ گیا تھا۔ اطہر نے پورے گھر کو اپنا چھپا ہوا مضمون دکھایا۔ جوش و مسرت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اسے تو یقین ہی نہیں تھا کہ اس کا مضمون بھی بچوں کے رسالے میں چھپ سکتا ہے۔ دوپہر میں اس نے اپنی پسندیدہ ڈش کھائی۔ شام ہوئی تو بڑے ماموں جان اس کے اچھے نمبروں میں پاس ہونے کی خوشی میں اس کے لئے نئی چمچماتی ڈیجیٹل گھڑی کا تحفہ لے آئے اور جب ماموں جان نے اپنے ہاتھوں سے اس کی کلائی میں گھڑی پہنا دی تو اطہر نے ماموں جان کا بے حد شکریہ ادا کیا۔

شام سات بجے اطہر نے ٹی وی کھولا تو "ریسلنگ" آرہی تھی۔ اطہر نے بڑی خوشی اور مسرت کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ "ریسلنگ" دیکھی۔ ریسلنگ دیکھتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ریسلنگ خاص طور پر اس کے لئے دکھائی جا رہی ہو۔

رات جب وہ سونے لیٹا تو اس کا پورا جسم خوشی و مسرت کے بے پناہ احساسات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے ہاتھ میں بندھی گھڑی کو چوما پھر تکیے کے نیچے سے بچوں کا وہ رسالہ نکالا جس میں اس کا مضمون چھپا تھا۔ اس نے اپنے مضمون کو کئی بار پڑھا۔ اسے پہلی بار بچوں کا وہ رسالہ بے حد اچھا لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ رسالے کے ایڈیٹر کو شکریئے کا خط لکھے گا۔ ایک گھنٹے تک خوب سوچ سوچ کر، جتنے الفاظ اسے آتے تھے، ان الفاظ کی مدد سے اس نے ایڈیٹر صاحب کو خط لکھا۔ اپنا مضمون چھاپنے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر خط جیسے ہی مکمل ہوا، اسے نیند آنے لگی۔ ذہنی طور پر وہ اتنا تھک گیا تھا کہ کاپی قلم میز پر بھی نہ رکھ سکا، قلم ہاتھ میں پکڑے اور کاپی سینے پر رکھ کر گہری نیند سو گیا۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں جب اس کی آنکھ کھُلی۔ کچھ دیر تک تو اطہر خالی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کاپی قلم ایک طرف رکھا۔ اسی وقت اس کے دل نے کہا۔

"تحفے دینے والوں کا شکریہ ادا کر کرکے تو تم نے اپنی زبان تھکا لی تھی لیکن تحفے بخشنے والے رب کا شکر ادا کرنے کے لئے تم دو لفظ اپنے منہ سے نہ نکال سکے.....!!!"

دل کی یہ بات سن کر اطہر جھٹ بستر سے اٹھا۔ وضو کیا، جاء نماز بچھا کر پہلے شکرانے کی اور پھر تہجد کی نماز ادا کی اور پھر بڑی عقیدت، اور عاجزی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے گڑگڑا کر اس نے کہا۔

"میرے پیارے اللہ میاں! جب مصیبت والا دن میرے حصّے میں آیا تھا تو میں نے آپ سے خوب شکوہ کیا تھا اور جب آپ نے بہت ساری خوشیوں والا دن بخشا تو میں آپ کو بھول گیا۔ اب میں آپ کو مصیبت اور خوشیوں میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے معاف کر دیجئے! مجھے معلوم ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے کیوں کہ آپ بہت اچھے ہیں!!!۔"

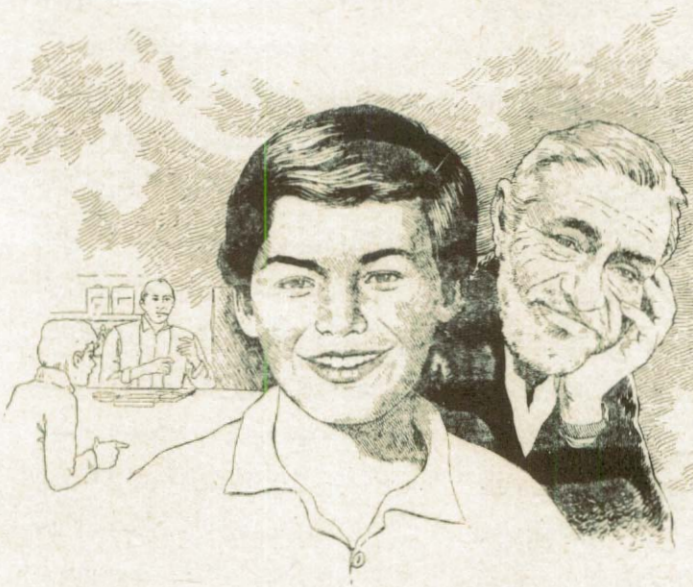

میں ایماندار بنوں گا

شگفتہ شمیم

"کیا مصیبت ہے۔ دادا جان نے بھی کس مشکل میں پھنسا دیا ہے مجھے۔" فہد اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بڑبڑایا۔ صبح سے سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہو گیا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ دادا جان نے اسے بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور فہد ہر حال میں اس امتحان میں کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ کھانا پینا، کھیلنا کودنا سب کچھ بھول بھال کر صبح سے صرف اور صرف سوچ رہا تھا۔

بات تو کوئی خاص نہیں تھی مگر شاید آج فہد کے ستارے گردش میں تھے جو اس کی شامت دادا جان کے ہاتھوں آگئی تھی۔ ہوا یوں کے صبح صبح فہد نے جیسے ہی بلا اٹھا کر باہر جانے کے لئے قدم بڑھایا تو دادا جان نے اسے روک لیا۔ وہ کچھ دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ فہد صبح سے شام تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ اور شام کے وقت بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ ایک دو روز تو دادا جان یہ سوچ کر چپ رہے کہ شاید فہد کا کوئی میچ وغیرہ ہو رہا ہو گا لیکن اب چار دن گزرنے کے بعد فہد کی لاپرواہیاں دادا جان کی برداشت سے باہر تھیں۔ انھوں نے ٹھان لیا کہ اس سے ضرور باز پرس کریں گے۔ اس

لئے انھوں نے آج صبح ہی صبح فہد کو جا پکڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" دادا جان کی رعب دار آواز آئی تو فہد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"کھیلنے دادا جان۔" فہد نے پلٹ کر جواب دیا۔

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کتنا کھیلو گے؟ صبح سے شام تک کھیلتے رہتے ہو۔" "وہ ..... چھٹیاں ہیں نا دادا جان۔" فہد لاڈ سے بولا۔

"تو کیا چھٹیوں کا یہ مطلب ہے کہ تم سارا سارا دن کھیلنے کودنے اور ٹی وی دیکھنے میں گزار دو۔" دادا جان برہمی سے بولے۔ "ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔" اس کے بعد دادا جان نے فہد کو اپنے پاس بٹھا کر وقت اور تعلیم کی اہمیت پر گھنٹے بھر کا لیکچر دے ڈالا۔

فہد پورے لیکچر کے دوران بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ دادا جان کی بات دل جمعی سے سنے مگر بار بار اس کا دھیان کھیل کے میدان کی طرف چلا جا رہا تھا۔

"سب لڑکے آ چکے ہوں گے۔ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے دیر ہونے پر اسے بُرا بھلا بھی کہہ رہے ہوں۔" فہد نے مسکینوں والی صورت بنا کر دادا جان کی طرف دیکھا۔ اس کی اس حرکت سے دادا جان کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"ہوں ..... سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں نا میری باتیں ..... کہاں سے آئیں گی۔ دھیان تو تمہارا کھیل کی طرف لگا ہوا ہے۔" دادا جان نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"اور اب میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں دو دن کا وقت دے رہا ہوں۔ ان دو دنوں میں خوب اچھی طرح غور کر کے مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے کیا بننے کا ارادہ ہے تمہارا؟"

"مگر دادا جان ....." فہد نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔" دادا جان نے فہد کی بات کاٹی۔ اور ہاں مجھے ایسے ہی کسی پیشے کا نام بتا کر ٹالنے کی کوشش مت کرنا۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تم نے جو بھی بننے کا ارادہ کیا ہو، مستقبل میں بھی اپنے اس فیصلے پر قائم رہنا ہے۔"

دادا جان اپنا یہ عجیب و غریب فیصلہ صادر کر کے جا چکے تھے۔ مگر اپنے پیچھے سوچ کی ایک گہری لکیر چھوڑ گئے تھے۔ فہد جانتا تھا کہ دادا جان کو ٹالنا بہت مشکل کام ہے۔ اور اتنا بڑا فیصلہ کرنا بھی دشوار تھا۔ فہد نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس نے سائنس کا مضمون لے رکھا تھا مگر اس لئے نہیں کہ اس کا ارادہ ڈاکٹر یا انجینئر بننے کا تھا۔ وہ تو اس کے سارے دوستوں نے سائنس کا مضمون لیا تھا، اس لئے فہد نے بھی لے لیا تھا۔

بچپن میں کبھی فہد نے ڈاکٹر بننے کے بارے میں سوچا تھا مگر اب اس کا ارادہ کم از کم ڈاکٹر بننے کا تو بالکل بھی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ایک کزن ڈاکٹر کو

دیکھ چکا تھا کہ وہ بے چارے کتنے پریشان رہتے ہیں۔ وقت بے وقت مریضوں کو دیکھنے دوڑے جاتے ہیں۔ پھر فہد کو یہ بھی پریشانی تھی کہ اس کے اتنے سارے دوست عزیز ہیں سب کا مفت علاج کرنا پڑے گا۔ کوئی دوست آئے گا اور کہے گا "دیکھو فہد میری نکسیر پھوٹ گئی ہے ذرا ٹھیک کر دو۔" کوئی عین دوپہر میں جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی اچھی سی کتاب پڑھ رہا ہو گا اسے اٹھا کر اپنے کسی عزیز کو دکھانے لے جائے گا اور فہد منع بھی نہیں کر سکے گا۔

"نہ بابا نہ ..... ڈاکٹر بننا تو بہت مشکل کام ہے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ تو پھر انجینئر ..... اونہہ ..... انجینئر بننا تو بالکل ناممکن ہے مجھے تو استری کا پلگ تک ٹھیک کرنا نہیں آتا۔ انجینئر کیا خاک بنوں گا۔"

"مگر انجینئرنگ کی تو بہت سی شاخیں ہوتی ہیں۔" اس کے دماغ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں انجینئر نہیں۔" وہ انجینئرنگ کے شعبے کو اپنے ارادوں کی لسٹ سے سختی سے خارج کر کے پھر سوچ میں پڑ گیا۔

فہد کو سب سے اچھا ادب کا شعبہ لگتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر کوئی مشہور ادیب بنے۔ مرزا ادیب یا چارلس ڈکسن جیسا مگر یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ ادیب بننا تو دور کی بات، فہد کو تو ایک چھوٹی سی کہانی لکھنی بھی نہیں آتی تھی۔ اس سلسلے میں اسے ایک تلخ واقعے سے بھی گزرنا پڑا تھا۔

ایک دفعہ فہد نے بقول اس کے ایک دلچسپ سی کہانی لکھی۔ اس نے سوچا ایسا نہ ہو کہ کہانی میں کسی غلطی کی وجہ سے ایڈیٹر اسے مسترد کر دے کیوں نا اپنے اُن کزن کو دکھا لے جو مقامی روزنامے میں کام کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن جب اس کے کزن جن کا نام ظفر بھائی تھا، اس کے گھر آئے تو فہد نے بڑے شوق سے اپنی کہانی اصلاح کے لئے دی۔ جوں جوں ظفر بھائی پڑھتے جا رہے تھے توں توں فہد کا دل خوشی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کہانی میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

"ظفر بھائی کہانی ٹھیک ہے نا۔ میں اسے رسالے میں....." مگر اس سے آگے فہد کچھ نہ کہہ سکا۔ ظفر بھائی آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" فہد نے پوچھا۔

"یہ کہانی تم نے لکھی ہے؟"

"ہاں! کیوں؟"

"جس وقت تم یہ کہانی لکھ رہے تھے اس وقت تمہاری طبیعت ٹھیک تھی؟"

"کیا مطلب ہے ظفر بھائی آپ کا؟"

شرمندگی سے فہد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بھئی ناراض مت ہو۔ ایسی کہانی میں نے کبھی پڑھی نہیں اس لئے پوچھ رہا ہو۔" ظفر بھائی

کے لہجے سے طنز جھلک رہا تھا۔

"کیا خرابی ہے اس کہانی میں؟"

"خرابی! مجھے تو یہ کہانی بغیر سر پیر کی مرغی لگ رہی ہے جسے ہضم کرنا بھی نہایت دشوار ہو۔" ظفر بھائی نے مذاق اڑایا۔ مگر پھر فہد کا چہرہ دیکھ کر فوراً سنبھل گئے۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ کس نسل کی گائے ہے جو ایک وقت میں ستر بچھڑے پیدا کرے۔ اور ایسا درخت دنیا کے کس خطّے میں پایا جاتا ہے جس میں سونے کے پھل اور چاندی کے پھول اُگتے ہوں۔"

"ظفر بھائی یہ ایک طلسماتی کہانی ہے۔" فہد نے بسورتے ہوئے کہا۔

"ہیں! یہ موجودہ زمانے کی کہانی میں طلسمات کا کیا ذکر؟" وہ مزید حیرت زدہ ہو گئے۔ "کیا تم نے طلسماتی کہانی میں کسی کو صبح ٹوتھ پیسٹ سے منہ دھو کر ڈبل روٹی کھاتے سنا ہے؟ اور طلسماتی کہانی کے کردار بسوں کے دھکے کب کھاتے ہیں؟ وہ تو بس قالین پر بیٹھتے ہیں اور پلک جھپکتے ہی اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بھئی مجھے تو یہ نہ کوئی طلسماتی کہانی دکھائی دے رہی ہے اور نہ ہی جدید دور کا کوئی افسانہ۔ میں تو اسے نہایت بے کار قرار دیتا ہوں۔" ظفر بھائی نے کہانی کے صفحات فہد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اب معاملہ فہد کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ظفر بھائی اس کی اس طرح تذلیل کریں گے۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ کہانی کسی رسالے میں بھیج دیتا۔ بے شک رسالے والے اس کی کہانی کو مسترد کر دیتے مگر اس طرح اس کی توہین تو نہیں کرتے۔ فہد نے اسی وقت کہانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور آئندہ سے لکھنے لکھانے سے توبہ کر لی۔

یہ تو بچپن کی بات تھی جب فہد ہر وقت کچھ نہ کچھ بننے کے بارے ہی سوچا کرتا تھا۔ مگر اب وہ کافی سمجھ دار ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ بننے کے لئے صرف خواب دیکھنا کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے لئے بہت زیادہ محنت کرنا بھی ضروری ہے۔ مگر کچھ بھی بننے کے لئے پہلے سے اس کا تعیّن کرنا ضروری ہے اور بقول دادا جان کے اب وقت آگیا ہے کہ فہد اپنی منزل کا تعیّن کر لے۔ جو فیصلہ کرنے کے لئے دادا جان نے اسے دو دن کا وقت دیا تھا اس میں سے ایک دن گزر چکا تھا اور فہد ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ فہد ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے ابو کے ساتھ بازار چلا گیا۔ وہاں ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال پر گھومنے کے دوران بھی اس کا دھیان مسلسل دادا جان کے فیصلے کی طرف لگا رہا۔ اس چکر میں اسے ایک دو دفعہ ڈانٹ بھی پڑتے پڑتے رہ گئی۔

بعض دفعہ انسان جب کسی ایسے حال کو پہنچ جائے جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو راہِ فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فہد بھی شاید دل سے یہی چاہ رہا تھا۔ اس لئے جب گھر پہنچا تو انکل عزیز

کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ انکل عزیز ان لوگوں سے مل کر جانے لگے تو فہد بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

انکل عزیز کی شہر کے وسط میں ایک بیکری تھی۔ ان کا کاروبار بہت اچھا جا رہا تھا۔ فہد کو انکل عزیز بہت اچھے لگتے تھے۔ اتنے نرم دل اور مہربان۔ ان کا برتاؤ فہد کے ساتھ ہمیشہ دوستوں جیسا رہتا تھا۔ فہد ابو کی ڈانٹ سے بچنے کے لئے انکل کے ساتھ ان کی دکان پر چلا تو آیا تھا مگر اب سخت بور ہو رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ اس نے گھر جانے کی اجازت لینے کے لئے انکل کی طرف دیکھا۔ وہ بہت مصروف نظر آ رہے تھے۔ ایک گاہک سے نمٹتے ہی دوسرا گاہک آ جاتا۔ انکل نے اپنی مدد کے لئے ایک لڑکے کو رکھا ہوا تھا جو مطلوبہ چیزیں کاؤنٹر پر رکھتا جاتا تھا اور انکل گاہک سے پیسے لے کر وہ چیزیں اسے تھما دیتے۔ کاؤنٹر کے نیچے والی دراز کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ جب انکل پیسے رکھنے کے لئے دراز کھولتے تو فہد کی نظر اس پر جا پڑتی۔ فہد نے کبھی اتنے پیسے ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھے تھے۔ سو، پچاس، دس پانچ اور بہت ساری ریزگاری سے دراز بھرتی جا رہی تھی۔

یونہی بیٹھے بیٹھے فہد کا ذہن اس پیشے کی طرف چلا گیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں بھی بڑا ہو کر اس پیشے کو اپناؤں پھر میں بہت دولت مند بن جاؤں گا۔ مگر شاید دادا جان کو یہ بات پسند نہ آئے۔"

"فہد" وہ ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ انکل کی آواز پر چونک پڑا۔

"ذرا اندر جا کر عمران سے کہنا کہ ایک ڈبل روٹی بھی لے آئے۔" انہوں نے مدد گار لڑکے کا نام لیتے ہوئے کہا۔

فہد دوکان سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں عمران لیک تھیلے میں کوئی چیز ڈال رہا تھا۔ "عمران ایک ڈبل روٹی بھی لے جاؤ۔"

"اچھا جی۔" وہ پلاسٹک کی تھیلی اٹھا کر کونے میں پڑی ہوئی ڈبل روٹیوں میں سے ایک ڈبل روٹی اس تھیلے میں ڈالنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، یہ تو باسی ہیں!" فہد نے حیرت سے کہا۔

"باسی نہیں ہیں سر جی، ٹھیک ہے۔" عمران نے باہر جانے کے لئے قدم بڑھایا۔

"اچھا دکھاؤ ذرا۔" فہد اس کے ہاتھ سے تھیلی لے کر ڈبل روٹی کو سونگھنے لگا۔ "اس میں سے تو بُو بھی آ رہی ہے۔"

اتنے میں انکل بھی کمرے میں آ گئے۔

"کیا بات ہے عمران۔ اتنی دیر کیوں لگا رہے؟" انہوں نے پوچھا۔

جواب میں عمران نے فہد کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بول پڑا "انکل عمران باسی ڈبل روٹی دے رہا ہے۔" مگر انکل نے اشارے سے اسے چپ کرا دیا۔

"عمران تم ڈبل روٹی لے جاؤ۔" انہوں نے عمران کو باہر بھیج کر فہد کی طرف دیکھا۔ "کوئی

بات نہیں یار..... چلتا ہے کاروبار میں سب کچھ۔ چلتا ہے..... ۔"

انکل فہد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہ جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے مگر فہد کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ تو بس ان کے چہرے کی طرف حیرت سے دیکھے جارہا تھا۔ ہمیشہ اتنے اچھے لگنے والے انکل اب اسے بہت خراب لگ رہے تھے۔ انکل جب دوبارہ کاؤنٹر کی طرف بڑھے تو فہد کچھ کہے سنے بغیر دکان سے باہر نکل گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چلا جارہا تھا۔

گھر پہنچ کر فہد سیدھا دادا جان کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے جارہے تھے۔ کیوں بھئی نماز نہیں پڑھنا کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جارہا ہوں دادا جان..... میں دراصل یہ کہنے آیا تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا؟" دادا جان بولے۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں بڑا ہو کر ایماندار بنوں گا۔"

فہد کی بات سن کر دادا جان مسکرا دیئے۔

"یہ تو بہت اچھی بات کہی ہے تم نے مگر اصل بات تو یہ نہیں ہے نا!"

"یہی تو اصل بات ہے دادا جان۔" فہد نے جلدی سے کہا۔ آپ کو مجھے سے شکایت تھی نا دادا جان کہ میں پڑھائی میں دل نہیں لگاتا ہوں۔ وقت ضائع کرتا ہوں مگر اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اور بڑے ہو کر بھی کچھ نہ کچھ بن ہی جاؤں گا۔ جو لوگ اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ ہے نا دادا جان۔" فہد نے دادا جان کی تائید چاہی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو فہد پھر بولنے لگا۔

"مگر اصل بات تو یہ ہے نا دادا جان کہ لوگ اپنے کام میں کتنے مخلص ہیں۔ میں آج آپ سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ مستقبل میں جس میدان کا بھی انتخاب کروں گا۔ جو بھی کام کروں گا پوری ایمانداری سے کروں گا۔ صرف اور صرف اپنے اللہ کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی بھلائی کے لئے۔" فہد کا پُرجوش لہجہ اس کے عزم اور حوصلے کی ترجمانی کر رہا تھا۔

"شاباش میرے بیٹے۔" فہد کے خاموش ہوتے ہی دادا جان نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

"میں تو تمہیں بہت نکما لڑکا سمجھتا تھا مگر آج تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا کہ تم نکمے نہیں بلکہ بہت قابل لڑکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم انشاءاللہ ضرور بڑے آدمی بنو گے۔" انہوں نے فہد کے گال تھپتھپائے۔ "چلو جلدی سے تیار ہو کر آؤ آج ہم دونوں اکٹھے نماز پڑھنے جائیں گے۔" "اور ہاں میں تمہیں صرف دس منٹ دیتا ہوں۔" دادا جان نے ہاتھ اٹھا کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو فہد ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

ان سے تعاون کیجیے

ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے

اور نگر نگر

ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

ان اداروں

کو اپنا باقاعدہ

ایجنٹ

مقرر کیا

ہے

محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولابخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی

خریدنے کے لیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے — ماہ نامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

بٹوارہ

نجمہ خان

یہ گزرے وقت کا ایک سچا واقعہ ہے۔

کچھ دن پہلے میرا بغداد سے گزر ہوا جو کبھی میرا آبائی شہر تھا۔ کسی کام سے مجھے وہاں ایک رات ٹھہرنا پڑا۔ اسٹیشن کے قریب ایک سرائے تھی۔

جس میں دور دراز کے شہروں سے آنے والے مسافر ٹھہرا کرتے تھے۔ میں بھی اسی سرائے میں ایک رات گزارنے کے خیال سے داخل ہوا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں نے کھانے کا آرڈر دیا۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو مجھے اپنے شہر کے لوگ، اپنے دوست احباب اور ان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ اچانک قریب سے ایک بوڑھے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"بوڑھوں میں تجربے کی وجہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کیونکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا تجربہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔"

تین لڑکوں سے اس بوڑھے کی بحث ہو رہی تھی۔ نوجوان کہہ رہے تھے۔

"یہ نیا زمانہ ہے۔ آج کا بچہ بھی بہت عقلمند ہوتا ہے۔ بوڑھے لوگ تو سیدھے سادے ہوتے ہیں۔"

بوڑھے کو اس سے اتفاق نہ تھا، اس کا کہنا تھا "تجربہ بہت بڑی چیز ہے جو ابھی تم لوگوں میں نہیں ہے۔"

یہ میری دلچسپی کا موضوع تھا کیونکہ میں بھی کبھی ایسے ہی اپنے والد صاحب سے بحث کیا کرتا تھا۔ میں نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے میں بھی آپ کی محفل میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

تینوں نوجوان خوشی سے بولے "ہاں ہاں بے شک! آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ تینوں نوجوان دوستوں نے اپنی اپنی عقلمندی اور سمجھداری کا ثبوت دے دیا۔ اب میں آپ سب کو آنکھوں دیکھا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس واقعے سے آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔" پھر میں نے واقعہ سنانا شروع کیا۔

"اسی شہر بغداد میں ایک امیر رہا کرتے تھے یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی وصیت اپنے بیٹوں کے نام لکھ دینا چاہتے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ اور اس کے علاوہ کچھ وہ اپنے لئے اللہ کے نام پر بھی خرچ کرنا چاہتے تھے۔

ان کے تینوں بیٹوں کا خیال تھا کہ جوانی کے ساتھ ساتھ عقل بھی کم ہوتی جاتی ہے اس لئے انسان بڑھاپے کی دہلیز میں جب قدم رکھ دیتا ہے تب وہ کچھ بے وقوفی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔

حالانکہ ان کے والد امیر نے کئی مرتبہ کہا "بیٹے اگر پوری محفل میں ایک بھی بوڑھا ہو تو وہ بابرکت محفل ہوتی ہے اور بزرگی کے رعب سے کوئی بھی شخص غلط بات کرنے یا غلط قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اور بوڑھوں کی تجرباتی آنکھیں آگے آنے والے حالات کو بھی دیکھ لیتی ہیں۔"

لیکن ان کے تینوں بیٹے اپنے باپ سے زیادہ اپنے آپ کو عقلمند اور سمجھدار سمجھتے تھے۔ اچانک ایک دن امیر کا انتقال ہو گیا۔ تینوں بیٹوں اور چھوٹے بھائی کو امیر کے انتقال کا بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ ویسے تو سب ہی دوست احباب ان کو بہت چاہتے تھے، جس کی وجہ سے سب ہی ان کے انتقال پر رنجیدہ ہوئے۔

کچھ دن کے بعد سب کو خیال آیا کہ امیر نے مرنے سے پہلے جو وصیت لکھی تھی اس وصیت کو دیکھ کر اسی حساب سے عمل کر لیا جائے۔ سب سے پہلے وصیت نامہ ان کے بھائی نے کھولا اور سب کو پڑھ کر سنایا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہ قائمیٔ ہوش و حواس یہ وصیت نامہ تحریر کیا ہے کہ میری ملکیت میں جو انیس (۱۹) اونٹ ہیں ان میں سے ۱/۵، ۱/۵ حصے کے حساب سے میرے تینوں بیٹوں کو ۱/۱۰ حصہ میرے بھائی کو اور ۱/۴ حصہ اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ کسی بھی اونٹ کو ذبح کر کے حصے نہیں کئے جائیں گے بلکہ ہر ایک کے پاس زندہ اونٹ جائیں گے۔ اونٹوں کی تقسیم کے بعد وصیت کے مطابق زمین و جائداد تقسیم ہوگی۔"

یہ وصیت پڑھ کر سب لوگ حیران ہو گئے امیر کے تینوں بیٹے اپنی اپنی عقل سے حساب لگاتے رہے لیکن کسی بھی طرح اس وصیت کے مطابق حصے تقسیم نہیں ہو پا رہے تھے۔ ان کے بھائی نے کہا کہ تم لوگ ان کو بڑھاپے میں خبطی سمجھنے لگے تھے حالانکہ بڑھاپے میں بھی وہ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی نیا حیران کن کام کرتے تھے جس کو دیکھ کر سب ہی حیرت زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ اب اسی طرح انہوں نے اپنے مرتے وقت بھی یہ عجیب و غریب وصیت نامہ تحریر کیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ صحیح وصیت نامہ لکھا ہوگا جس کو ہم ہی نہیں سمجھ پا رہے۔ ہمارے حساب سے جب تک کسی ایک اونٹ کو ذبح نہیں کیا جائے اس کے حصے ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ جبکہ وصیت نامہ میں ذبح نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اسی کشمکش میں کئی ماہ گزر گئے۔ وہ سب ان کی وصیت کے مطابق ہی حصہ لینا چاہتے تھے۔ کوئی بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی کوئی اپنا حصہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک دن انہوں نے پورے شہر میں اعلان کرا دیا کہ جو کوئی بھی اس وصیت کے مطابق اونٹ کے ٹھیک ٹھیک حصے لگا دے گا۔ اس کو ایک اونٹ انعام دیا جائے گا۔ اس خبر کو سن کر شہر کے اکثر نوجوان آتے اور بہت بہت سوچ و بچار کرتے لیکن ناکام ہی لوٹ جاتے کسی کی بھی سمجھ میں یہ وصیت نہیں آسکی۔

ایک دن اچانک ایک بزرگ تشریف لائے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، سفید داڑھی، گلابی رنگت، سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے امیر کے مکان کے دروازے پر اپنے اونٹ کو روکا اور پھر خود اونٹ سے نیچے اترے اور انہوں نے کہا۔

"مرحوم امیر کے بھائی اور بیٹوں کو بلاؤ۔"

جب مرحوم امیر کے ورثا آئے تو ان سے بزرگ ہستی نے کہا "وصیت نامہ لاؤ۔"

مرحوم امیر کے بھائی نے وصیت نامہ لا کر بزرگ کو دیا۔ بزرگ نے وصیت نامہ کو بغور پڑھا پھر وہ کہنے لگے کہ انیس (۱۹) اونٹ وصیت نامے کے مطابق لے آؤ۔" سب حیران ہوئے کہ انیس (۱۹) اونٹ یہاں کیوں منگا رہے ہیں۔ لیکن امیر کے بھائی نے فوراً عمل کیا اور انیس (۱۹) اونٹ لے آیا۔ یہ سب باتیں سن کر سب لوگ امیر کے مکان کی طرف جمع ہونے لگے کہ دیکھیں

وصیت کے مطابق کس طرح حصے تقسیم ہوتے ہیں اور کون عقلمند شخص ان کی تقسیم کرتا ہے۔

جب انیس (۱۹) اونٹ آگئے تو بزرگ نے اپنا ایک اونٹ بھی ان میں ملا دیا۔ سب لوگوں کے منہ سے حیرانی میں نکلا کہ یہ اپنا اونٹ ان میں کیوں ملا رہے ہیں۔ تب انہوں نے انگلی کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کے لئے کہا۔

جب بیس (۲۰) اونٹ ہوگئے تب انہوں نے کہا

"بیس (۲۰) کا ۱/۵ حصے کے حساب سے ہر بیٹے کو چار چار اونٹ دے دیئے جائیں۔ یعنی تینوں بیٹوں کے بارہ اونٹ الگ کر دو۔"

بیٹوں نے اپنا اپنا حصہ لے لیا۔ اب بچے آٹھ اونٹ۔

بزرگ نے پھر کہا "۱/۱۰ حصہ یعنی دو اونٹ ان کے بھائی کو دے دو۔"

دو اونٹ ان کے بھائیوں نے لے لئے اب بچے چھ اونٹ۔

بزرگ نے کہا ۱/۴ حصہ یعنی پانچ اونٹ اللہ کی راہ میں نکال دو۔ "اب باقی بچا ایک اونٹ۔"

بزرگ مسکرائے اور وہاں کھڑے اپنے اونٹ پر بیٹھ گئے اور پھر کہا

"باقی رہا ایک اونٹ جو میرا تھا میں نے لے لیا۔"

سب لوگ حیرانی سے اس عظیم ہستی کو دیکھ رہے تھے وصیت کے مطابق سب اونٹوں کو بانٹ کر وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ امیر کے بیٹے پشیمان بھی تھے کیونکہ آج انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اپنے وسیع تجربے کی وجہ سے عقلمند اور سمجھدار بزرگ ہی ہوا کرتے ہیں اور ان ہی کے بابرکت قدموں سے ہر مشکل کام آسان ہو جایا کرتا ہے۔ جس طرح نا تجربے کاری کی وجہ سے کئی ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا آج ایک بزرگ ہستی نے اپنے تجربے کی بنیاد پر منٹوں میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

"دوستو! ان مرحوم امیر کا چھوٹا بیٹا میں ہوں۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح ہی خود کو عقلمند سمجھا کرتا تھا لیکن اب میں بزرگوں کی عزت کرتا ہوں، ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اچھا اب آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں کیونکہ اب صبح ہونے والی ہے اور میری گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔

اعلان

جنوری ۱۹۹۳ء میں آنکھ مچولی کے حصہ "قلم قتلے" میں انعامی مقابلہ بعنوان "ایجادات دریافت کریں اور انعام بھی پائیں" میں بالکل درست جوابات بھیجنے والے اور قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے ساتھیوں کے ناموں کا اعلان آئندہ ماہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

خلیفہ دوم

حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہ

آپ کا نام عُمر، کنیت ابو حفصی اور لقب فاروق تھا۔ آپ قبیلۂ قریش کی شاخ بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی عمر کے ۲۷ ویں برس میں اسلام قبول کیا۔ آپ کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھُلے میدان میں نماز ادا کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ۶۳۴ء میں مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ اسلام کا انتہائی سنہرا دور ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں مسلمانوں نے عرب کے علاوہ عراق، شام، فلسطین اور مصر کے علاوہ دوسرے بڑے بڑے علاقے فتح کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں زرّیں اصلاحات نافذ کیں جس کی وجہ سے آپ کا شمار دنیا کے عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے سنِ ہجری کا آغاز کیا۔ پہلی مرتبہ آپ نے ۱۵ھ میں فوج کے لئے علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ آپ کی خلافت کا دور گیارہ سال تھا۔ ایک روز پارسی غلام جس کا نام ابو لولو فیروز مجوسی تھا، نے نمازِ فجر کے وقت آپ پر زہر آلود خنجر کے چھ وار کیے۔ ان زخموں سے تین دن بیمار رہ کر آپ نے ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

شہلا صدیقی، ٹنڈو آدم

ہر حال میں خوش رہو

مسرور احمد ریحان، اسلام آباد

"ارے ...... ابّو، ابّو ...... آپی ، دوڑ کر آیئے گا۔" میں نے زور دار آواز لگائی۔

"کیا ہوا بیٹا...... کیا ہوا؟" ابّو اور آپی جلدی سے بھاگے آئے۔

"کیا کسی بھڑ نے کاٹ لیا؟" آپی نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جی نہیں، وہ بھی صبح صبح اس وقت اللہ کی عبادت کرتی ہیں۔ آپ کی طرح تو نہیں ہیں۔" میں نے بھی جل کر کہا، مگر اس سے پہلے کہ میں آپی کو مزید کچھ جلی کٹی سناتا، ابّو نے بیچ میں مداخلت کی۔

"آخر بات کیا ہے بیٹا؟" ابّو نے پوچھا۔

"ابّو دیکھیں، آج کے اخبار میں ۵۰ روپے والے انعامی بانڈز کی قرعہ اندازی شائع ہوئی ہے۔ شاید ہمارا بھی نکلا ہو؟" میں نے ابّو کو اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے پہلے کہ ابو کچھ کہتے، آپی نے مداخلت کی۔ "ہاں ہاں بڑا نکلا ہو گا "پرائز بانڈ"، وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

"ہاں جی! بانڈ نکلے گا تو میرا نکلے گا، آپ کا تو ٹھینگا نکلے گا۔" میں نے انہیں انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔ اور آپی بُری طرح چڑ گئیں۔

اتنے میں بھائی جان اور امّی بھی آگئے، ابّو بھی بانڈز نکال کر لے آئے تھے۔

"یہ ۰۴۰۴۵ اور یہ ۰۴۰۴۶، صرف ایک نمبر کا فرق ہے۔" ابّو بڑبڑائے۔

"۰۵۹۵۴ اور یہ بھی ۰۵۹۵۴ ارے!!!" ابّو خوشی سے چلائے۔ "او..... بھئی ہمارا پانچ ہزار روپے کا بانڈ نکل آیا ہے۔" خوشی سے ہماری باچھیں کھل اٹھیں۔

"اور یہ دوسرا بھی ہے۔" ابّو پھر خوشی سے بولے۔ اور ہم میں گرمجوشی کی لہر دوڑ گئی۔

ہمارے دس ہزار روپے کے بانڈز نکل آئے تھے۔ "مگر ابّو جب تک آپ دس ہزار روپے گھر نہیں لائیں گے، میں اس پر یقین نہیں کروں گا۔" ایسے میں بڑے بھائی بولے۔ ہم سب نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"جی ہاں ..... ابّو آپ اچھی طرح تسلی کرلیں۔" میں نے بھی بڑے بھائی کی تائید کی۔

"اجی ..... آپ پھر غور سے دیکھ لیں۔" امّی نے پہلی بار زبان کھولی جو ہماری گفتگو سے قطعی طور پر لاتعلق کھڑی تھیں۔ ابّو نے پھر دوبارہ غور سے نمبروں کا جائزہ لیا۔

"او..... ہو....." آخر کار ابّو کی افسردہ آواز سنائی دی۔

"جنہیں ہم دس ہزار کے سمجھ رہے تھے وہ تو صرف چار سو کے ہیں۔" ابّو نے کہا اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ذرا نظر ثانی کرلیں۔" بھائی جان بولے۔

"ایک تو دس ہزار ہاتھ سے گئے اور تم خوشی سے یہ کہہ رہے ہو۔" آپی نے بھڑک کر کہا۔

"بھائی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

ہم سب افسردہ کھڑے تھے کہ ابّو مسکرا کر بولے، "بھئی دس ہزار کی جگہ یہ چار سو

ہی غنیمت ہیں۔" آپی پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

"ارے!!" اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔

"مگر یہ پرائز بانڈز ہیں کس کے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو تمہارا ہے۔" ابّو نے میری طرف اشارہ کیا اور میں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔

"اور دوسرا؟" میں نے سوال کیا۔

"آپی کا۔" ابّو نے آپی کی طرف اشارہ کیا جو کہ دس ہزار سے ۴ سو ملنے کا سن کر غمگین تھیں۔ ابّو نے مسکرا کر آپی کو دیکھا پھر کہا، "بیٹا! جو مل جائے، اسے غنیمت جانو، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرو۔"

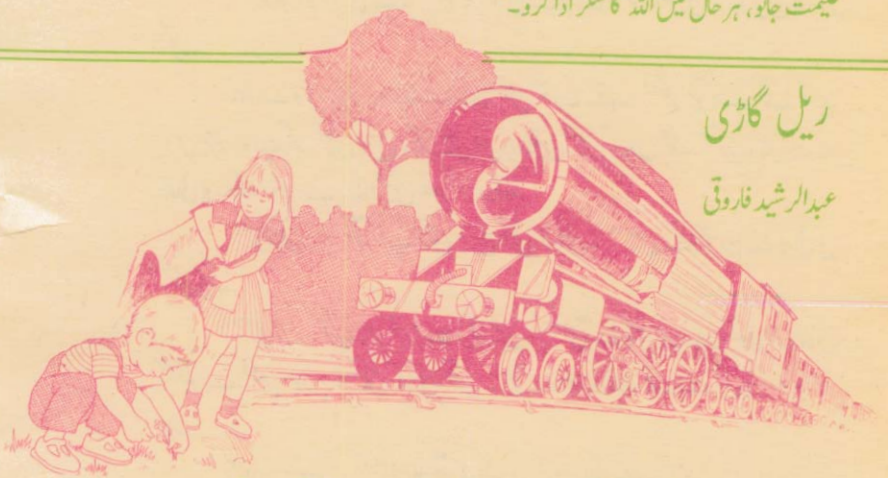

ریل گاڑی

عبدالرشید فاروقی

چھک چھک کرتی آتی ہے　　چھک چھک کرتی جاتی ہے
ہر دم چلتی رہتی ہے　　خدمت سب کی کرتی ہے

آگ سے قوت پاتی ہے　　بجلی سے بھی چلتی ہے
بچّوں کو یہ بھاتی ہے　　ان کو سیر کراتی ہے

سیٹی دور سے بجتی ہے　　تیزی سے یہ چلتی ہے
چھک چھک کرتی آتی ہے　　چھک چھک کرتی جاتی ہے

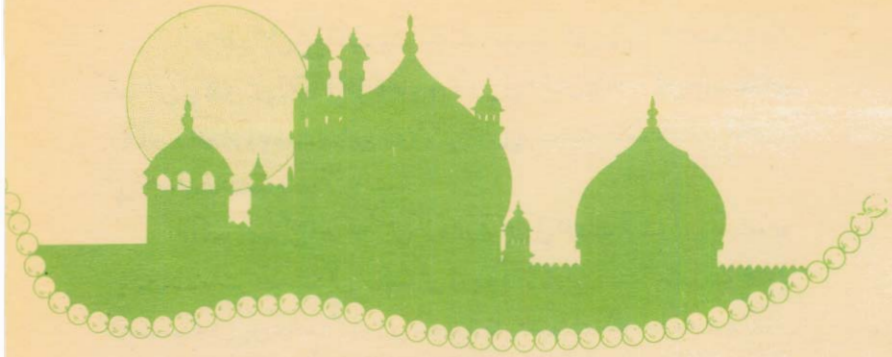

اورنگ زیب عالمگیر

خاندانِ مغلیہ کا درویش صفت بادشاہ

مغلیہ خاندان نے ہندوستان پر صدیوں تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس خاندان میں کئی نامور بادشاہ گزرے ہیں جن میں ایک بڑا بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔

اورنگ زیب کا اصل نام محی الدین تھا۔ اس کے والد شاہ جہان بادشاہ نے اسے عالم گیر کا خطاب دیا تھا۔ اورنگ زیب ۴ نومبر ۱۶۱۸ء کو اتوار کے دن پیدا ہوا۔ وہ شاہ جہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ اس کی والدہ ارجمند بانو بیگم ہیں جو ممتاز محل کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ اورنگ زیب کی پیدائش کے وقت ہندوستان پر جہانگیر بادشاہ کی حکومت تھی اور اس کا بیٹا شاہ جہان یعنی اورنگ زیب کا باپ، اس وقت دکن کا صوبے دار تھا۔ جب جہانگیر کا انتقال ہوا تو شاہ جہان تخت پر بیٹھا۔ اس نے اورنگ زیب کی تعلیم کے لئے ملک کے نامی گرامی عالم مقرر کئے جن میں میر محمد ہاشم اور ملّا صالح، جو زبردست عالم اور بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب پہلا بادشاہ تھا جس نے قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ وہ ۱۶۵۸ء میں ابو المظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کا لقب اختیار کر کے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اورنگ زیب بلا کا محنتی تھا۔ وہ رات دن کام کرتا۔ ایک انگریز سیاح نے ۷۸ برس کی عمر اسے میں دیکھا تھا۔ انگریز سیاح اورنگ زیب کے کام اور محنت پر حیران ہو کر لکھتا ہے۔

"وہ سفید ململ کی پوشاک پہنے تخت کے سہارے، امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی پگڑی میں زمرّد کا ٹکڑا لگا تھا۔ وہ لوگوں کی عرضیاں لیتا اور انہیں عینک کے بغیر دیکھتا اور دستخط کرتا جاتا ہے اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مصروفیات سے بے حد خوش ہے۔

اورنگ زیب صبح اٹھ کر غسل کرتا اور قرآن کی تلاوت کرتا۔ اس کے بعد وہ چاشت کے وقت مسجد سے نکل کر پہلے محل میں جاتا اور پھر وہاں سے انصاف کے تخت پر بیٹھتا۔ یہ گویا اس کی عدالت تھی۔ اس کے دربار میں سب برابر تھے۔ وہ عام دربار لگاتا۔ جس میں سلطنت کے کاروبار پر سوچ بچار کیا جاتا تھا۔ جمعرات کو آدھے دن کی چھٹی اور جمعہ کو پورے دن کی ہوتی تھی۔ اورنگ زیب بہت سنجیدہ اور بُردبار تھا۔ اس جیسا عبادت کرنے والا بادشاہ مغلوں کی تاریخ میں نہیں گزرا۔ وہ ہفتے میں چار دن روزے رکھتا تھا۔

آخر پچاس سال تین ماہ حکومت کرنے کے بعد ۹۱ سال کی عمر میں احمد نگر میں اس کا انتقال ہو گیا اور قصبہ خلد آباد ضلع اورنگ آباد میں دفن ہوا۔ اورنگ زیب کا مقبرہ دوسرے بادشاہوں کے عظیم الشان مقبروں کے برخلاف بالکل سادہ سا ہے اور قبر بھی کچّی ہے۔

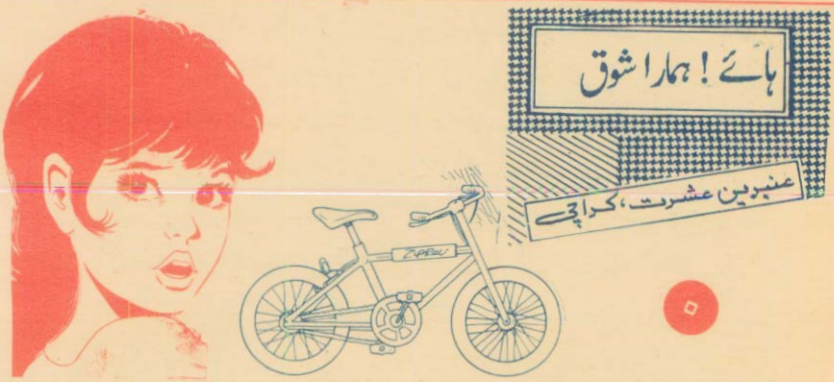

ہائے! ہمارا شوق

عنبرین عشرت، کراچی

آپ کو تو معلوم ہے جب ہم نے اپنے کباڑ خانے کی صفائی کی تو ایک سائیکل بر آمد ہوئی ویسے تو سائیکل دیکھ کر ہمیں بڑی شرم آئی مگر ہم نے سوچا چلو کوئی بات نہیں کام چل جائے گا۔ پھر سوچا کہ مرحوم پطرس بخاری کی سائیکل سے تو اچھی ہے۔ یہ سوچ کر سائیکل کی صفائی شروع کر دی۔ سائیکل ہم سے بہت چھوٹی تھی اور ایک پہیّہ شہید ہو چکا تھا البتہ اتفاق سے

دوسرا پہیّہ سلامت تھا۔ ایک تو ہمیں سائیکل چلانی نہیں آتی تھی دوسرے چلانے کی بھی دُھن سوار تھی۔ ہم راستے بھر سائیکل کو اپنے ساتھ ایسے چپکائے رہے جیسے کوئی ہم سے ہماری سائیکل چھین لے گا۔ جب ہم سائیکل والے کی دکان پر پہنچے تو اس نے پہلے ہمیں اور پھر ہماری سائیکل کو دیکھا۔ کیونکہ ہم گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ سائیکل والے نے ہمیں گھورا اور بولا "کیا اس کو عجائب گھر بھجوانا ہے؟" "جی نہیں اس کا تو پہیّہ لگوانا ہے اور ہوا بھروانی ہے۔" ہم نے شرمندہ ہو کر کہا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم نے اپنا بہترین لباس پہنا اور بڑی شان سے ایک دوست کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ہماری دوست عاصمہ کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم پیدل بھی جاسکتے تھے مگر سوچا کہ کیوں نہ عاصمہ کے سامنے ذرا شو ماریں۔ یہ سوچ کر سائیکل کا رخ عاصمہ کے گھر کی طرف کر دیا مگر یہ کیا! سائیکل تو بائیں طرف جا رہی ہے جبکہ ہینڈل کا رخ دائیں طرف ہے۔ ہم نے ہینڈل پر پورا زور ڈال دیا۔ اس کوشش سے ہینڈل ہمارے ہاتھ میں آ گیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے زمین گھوم گئی اور پھر ہم فٹ پاتھ سے ٹکرا کر کیچڑ میں جو گرے تو ہمارے کپڑے برباد ہو گئے۔ پہلے جو کپڑے پیلے تھے اب نیلے ہو چکے تھے۔ ہمیں اپنی سائیکل کہیں نظر نہیں آئی۔ ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک ہاتھ بڑی زور سے ہمارے کندھے پر پڑا۔ ایک موٹی خاتون نے شاید ہمیں وہی دفنانے کا سوچا تھا اور پھر ہماری پٹائی شروع ہو گئی۔ جب وہ تھک گئیں تو ہم نے ہائے ہائے کرتے ہوئے پوچھا، "آخر ہوا کیا ہے؟" انہوں نے غصے سے کہا "ایک تو سائیکل مارتی ہو پھر وجہ پوچھتی ہو خانہ خراب! سارے کپڑے گندے ہو گئے۔" ہم نے ان کے کپڑوں پر نظر ڈالی تو تکلیف کے باوجود ہماری ہنسی نکل گئی۔ وہ ہمیں ہنستے دیکھ کر ہمارے اوپر جھپٹی اور ہم بچاؤ بچاؤ کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔ ایسے میں ہماری ٹکر ایک راہ گیر سے ہو گئی۔ وہ بے چارہ زور سے تانگے سے ٹکرایا۔ اس طرح تانگے والے سے اس کی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہم لڑائی چھوڑ کر گھر کو بھاگے۔ گھر پہنچے تو امی جان نے کہا "معاف کرو!" "آج جمعرات نہیں ہے۔" ہم نے اپنا سر پیٹ لیا اور انہیں یقین دلایا کہ میں آپ کی بیٹی، آپ کی آنکھ کا تارا عنبرین ہوں، تب کہیں جا کر انہیں یقین آیا کہ میں عنبرین ہوں۔ بہرحال ہم نے سائیکل چلانے سے توبہ کر لی ہے کیونکہ یہ ہمارا شوق نہیں!!!

کرکٹ

سیّد وقار حیدر رضوی، دھارجی

- ...... سب سے پہلے فرسٹ کلاس گیند پاکستان کی جانب سے محمد سعید نے کھیلی۔
- ...... سب سے پہلا فرسٹ کلاس کیچ ظفر احمد نے لیا۔
- ...... سب سے پہلے کرکٹ میں کوئی وکٹ کیپر نہیں ہوتا تھا۔
- ...... سب سے پہلے ویسٹ انڈیز نے پاکستان کا دورہ ۱۹۴۸ء میں کیا۔
- ...... سب سے پہلے ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی گیند اے۔ شا نے پھینکی تھی۔
- ...... سب سے پہلے ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی وکٹ ہیل نے حاصل کی تھی۔
- ...... سب سے پہلے ٹیسٹ وکٹ پاکستان کی جانب سے خان محمد نے حاصل کی۔
- ...... سب سے پہلے ٹیسٹ میچ ۱۸۸۰ء میں مشہور کرکٹ گراؤنڈ اوول میں کھیلا گیا تھا۔
- ...... سب سے پہلا ٹیسٹ میچ آسٹریلیا اور برطانیہ کے درمیان ہوا۔
- ...... سب سے پہلی ٹیسٹ سنچری ۱۸۷۷ء میں بنائی گئی۔
- ...... سب سے پہلے کرکٹ کمنٹری ۱۹۲۷ء میں کی گئی۔
- ...... سب سے پہلا ٹیسٹ میچ آسٹریلیا نے برطانیہ سے ۷ رنز سے جیت لیا تھا۔
- ...... سب سے پہلا ورلڈ کپ کرکٹ ایک اننگز اور ۶۰ اوورز پر مشتمل تھا۔
- ...... سب سے پہلی ہیٹ ٹرک ۱۸۷۹ء میں آسٹریلوی بالر لیوفورتھ نے انگلستان کے خلاف بنائی۔

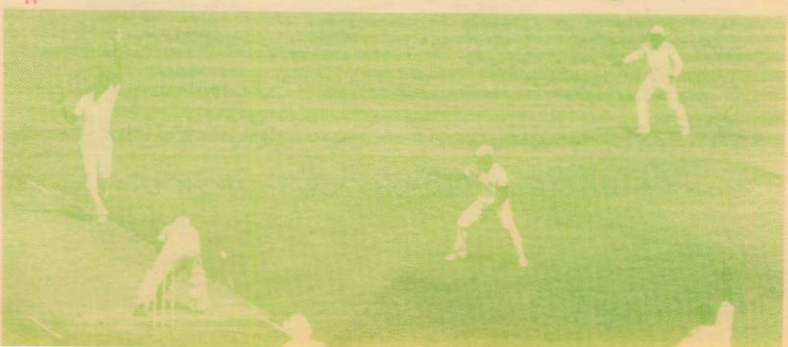

موئن جودڑو

سیّد فرحان، کراچی

موئن جوڈرو کا سندھی زبان میں مطلب ہے، "مُردوں کا ٹیلہ" اس قدیم شہر کے آثار ضلع لاڑکانہ سندھ سے تقریباً ۲۷ کلومیٹر کے فاصلے پر ملے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں اتفاقاً اس جگہ سے کچھ پکی اینٹیں برآمد ہوئیں۔ اس سے پیشتر وہاں کچھ ٹیلے اور کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ ہوتے ہوتے ان ٹیلوں اور پکی اینٹوں کی خبر محکمۂ آثارِ قدیمہ کو ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں آثارِ قدیمہ کے ڈائریکٹر سرجان مارشل کی نگرانی میں یہاں کھُدائی کا کام شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ان ٹیلوں کی کھُدائی سے ایک بہت بڑے شہر کے کھنڈرات برآمد ہوئے۔ سرجان مارشل کے اندازے کے مطابق سندھ کے لوگوں کا رہن سہن تقریباً تین ہزار سال قبلِ مسیح میں بھی نہایت اعلیٰ معیار کا تھا۔

کھنڈرات کی کھدائی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ شہر بہت بڑا اور کئی کلومیٹر کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں نہ صرف چوڑی تھیں، بلکہ ان کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بنایا گیا تھا۔ شہر کے باہر کی طرف ایک پختہ سڑک تقریباً ۹ میٹر چوڑی ہے۔ جس کے دونوں طرف دُکانیں تھیں۔ ہر گھر کے آگے ایک دروازہ تھا، مگر کھڑکیوں کے آثار نہیں ملتے۔ صفائی کا عمدہ انتظام تھا۔ ہر گھر میں ایک یا دو کنویں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ نہانے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک حمام کے آثار ملے ہیں، جہاں درمیان میں ایک بہت بڑا حوض ہے۔ جس میں نیچے اترنے کیلئے سڑھیاں ہیں۔ اس کے چاروں طرف برآمدے تھے۔

گندے پانی کی نکاسی کا بڑا عمدہ انتظام تھا۔ ہر گھر کی نالیاں بڑے نالے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ گندے پانی کی یہ نالیاں اوپر سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

موئن جوڈرو کے لوگ بنیادی طور پر کاشتکار تھے۔ وہ چاول، گیہوں، جوار، باجرہ اور کپاس پیدا کرتے تھے۔ ان کی خوراک اناج کے علاوہ دودھ، دہی، مکھن، سبزیاں اور گوشت تھی۔ وہ زیادہ تر مٹی کے بنے ہوئے برتن استعمال کرتے تھے۔ گھروں میں گیہوں رکھنے کیلئے مٹی کے بڑے بڑے ڈرم تھے۔ وہ کچھ دھاتوں کا استعمال بھی جانتے تھے۔ عورتیں

سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات پہنتی تھیں۔ بچوں کے لئے مٹی کے کھلونے بنائے جاتے تھے۔ کھلونے ان کی تہذیب کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس زمانے کی بیل گاڑیوں کا جو نمونہ ملا ہے، ویسی بیل گاڑیاں آج بھی سندھ کے بالائی حصوں میں پائی جاتی ہیں۔

وہ لوگ مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کا لباس بڑا سادہ اور مختصر تھا۔ عورتیں اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ لیتی تھیں، جیسے آج کل ساڑھی باندھی جاتی ہے۔ مرد بھی جسم کے گرد چادر لپیٹ لیتے اور اس کا ایک حصہ کاندھوں پر ڈال لیتے تھے۔ یہ لوگ جنگلی جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ دوسرے کاموں اور شکار کیلئے انہوں نے طرح طرح کے ہتھیار اور اوزار بنائے ہوئے تھے۔

یہ عظیم تہذیب کیسے ختم ہوئی؟ اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ اتنا بڑا شہر کس طرح تباہ ہو گیا؟ خیال ہے کہ دریائے سندھ کے سیلابوں نے بڑی حد تک تباہی مچائی اور جو کچھ باقی بچا اس کو آریاؤں نے ختم کر دیا۔

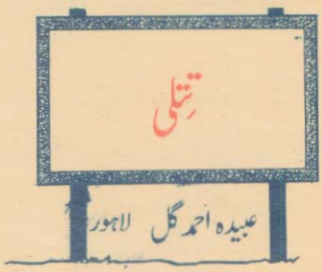

تتلی

عبیدہ احمد گل لاہور

تتلی آئی تتلی آئی باغ میں دیکھو تتلی آئی
جنّت کی وہ ایک پری ہے رنگ برنگی تتلی آئی
اتنی پیاری پیاری تتلی اپنا رنگ جمانے آئی
بچّے دوڑے اس کے پیچھے ہاتھ کسی کے وہ نہ آئی
باغ کا چپّہ چپّہ دیکھا لوٹ کے تتلی پھر نہ آئی

ہم بنے ادیب

محمد آصف محمود۔ راولپنڈی

مختلف کہانیاں اور مزاحیہ تحریریں پڑھ کر ہمارا جی بھی چاہا کہ ہم بھی ادیب بنیں۔ ادیب بننے کے لئے ہمیں کاغذ قلم کی ضرورت تھی۔ ہماری رف عمل کی کاپی ختم ہو چکی تھی۔ ہم کاغذ حاصل کرنے کی ترکیب سوچنے لگے تو یاد آیا کہ باجی کی کتابوں کی الماری میں ایک عدد خوبصورت لیٹر پیڈ موجود ہے جس پر وہ اپنی سہیلیوں کو خط لکھتی ہیں۔ سب گھر والے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے پی ٹی وی پر ڈرامہ "مقدمۂ کشمیر" دیکھ رہے تھے۔ ہمارے امتحانات چوں کہ قریب تھے اس لئے ہمیں ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ہم ڈرتے ڈرتے باجی کے کمرے میں پہنچے اور کانپتے ہاتھوں سے الماری کھولی اور سامنے پڑے ہوئے لیٹر پیڈ کو اٹھایا اور تین اوراق پھاڑ کر جلدی سے اسے الماری میں رکھ دیا اور پھر چپکے رہے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ اوراق ہم نے تہہ کر کے اپنی کتاب میں چھپا دیئے۔ لکھنے کے لئے جیومٹری بکس سے قلم نکالا تو وہ بالکل خالی تھا۔ ہم نے روشنائی کی دوات نکالی اور ڈھکنا کھول کر اسے بیڈ پر رکھا اور پلٹ کر الماری بند کی۔ بے خیالی میں دوات کو ہاتھ لگا تو آدھی روشنائی بستر کی نئی دھلی اجلی چادر پر اپنے نقش و نگار بنا گئی تھی۔ ہم نے جھٹ اپنی کتاب سے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ایک ورق نکالا اور چادر کو صاف کرنے کی کوشش کی جس سے خود ہمارے ہاتھ رنگ دار ہو گئے۔ ہم نے ہمت کر کے قلم میں روشنائی بھری اور اپنے گڈمڈ خیالات سے ایک کہانی تشکیل دی۔ کہانی کچھ یوں تھی: امجد شریف لڑکا تھا۔ وہ بے حد محنتی تھا اور کلاس میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ اس کے والدین اس سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک دن وہ سکول سے واپس آرہا تھا۔ روڈ پار کرتے ہوئے

اسے ایک کار نے ٹکر مار دی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا..... ہم ابھی اتنا ہی لکھ پائے کہ باجی کی موٹی کتاب ہمارے سر سے ٹکرائی اور ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "تمہیں شرم نہیں آتی؟ بغیر پوچھے میرے لیٹر پیڈ سے اوراق نکال لئے۔ وہ لیٹر پیڈ میں اپنی سہیلی کو تحفے میں دینے والی تھی۔" باجی ہمارے سر پر کھڑی گرج برس رہی تھیں "اور یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟" باجی نے قریب آکر دیکھا۔ "اچھا تو پڑھائی کرنے کے بجائے کہانی لکھی جا رہی ہے۔ ادیب بننے چلے ہیں منے میاں۔" اتنا کہہ کر باجی تو چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ابا میاں ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم نے انہیں دیکھ کر کہانی کے اوراق چھپانے چاہے لیکن وہ باجی کی زبانی سب کچھ سن چکے تھے۔ "نالائق! امتحان قریب ہیں اور پڑھنے کے بجائے کہانیاں لکھ رہا ہے۔ ابو نے ہمارا کان پکڑ کر جو تا سنبھال لیا اور پھر..... چھوڑیئے ہمیں شرمندہ نہ کریں، بس ہم نے ادیب بننے سے توبہ کر لی ہے۔

یادگار دن

عرفان امیر، لاہور۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا اور تمام اسکولوں میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ہمارے اسکول میں بھی چھٹیاں پڑ چکی تھیں۔ پہلا دن تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ آج پکنک منانے چلتے ہیں۔ ہم نے امی جان کو کہا تو وہ بولیں "پہلے گھر کو تو ٹھیک کر لو۔ یہ دیکھ تمہارا اسکول کا بیگ کہاں پڑا ہوا ہے" خیر ہم نے صبح اور دوپہر اپنی ساری چیزیں سنبھالیں۔ گھر کی صفائی کی۔ پھر ہم نے کپڑے تبدیل کئے۔

تھوڑی دیر بعد ابو بھی آگئے لیکن یہ دیکھ کر ہمارا منہ لٹک گیا جب ہم نے ابو کے ساتھ ان کے چند دوستوں کو دیکھا۔ پھر شام کو وہ گئے تو امی جان بولیں "بس اب سو جاؤ۔ پکنک پر کسی اور دن چلیں گے" لیکن نیند تو ہم سے دس کروڑ میل دور تھی۔ پھر سوچتے سوچتے نہ جانے رات کے کس حصے میں ہماری آنکھ لگ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو سورج مشرق سے اپنی بہار دکھلا رہا تھا اور ہم بستر پر بڑی کاہلی سے لیٹے سوچ رہے تھے کہ چھٹیوں کا ایک دن غارت ہو گیا جو ہماری پکنک کا یادگار دن ہوتا۔

ظالم کے ساتھ .....

خلد بشیر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ اسے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ جب وہ آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر پنجرے میں بند ہے۔ شیر نے درد بھری آواز میں کہا "اگر تم مجھے اس پنجرے سے آزاد کر دو تو میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" اس آدمی کو شیر پر ترس آگیا۔ اس نے پنجرہ کھول دیا۔ جونہی پنجرہ کھلا۔ شیر نے ایک چھلانگ لگائی اور باہر آگیا۔ اب آدمی جانے لگا تو شیر نے کہا "میاں کہاں جاتے ہو اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اب تو وہ آدمی بہت گھبرایا اور کہا "میں نے تو آپ کو پنجرے سے باہر نکالا ہے اور آپ مجھے احسان کا بدلا بدی سے دے رہے ہیں" شیر نے کہا "ہمارے جنگل کا یہی قانون ہے کہ نیکی کا بدلا بدی سے دیا جاتا ہے۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا تو آؤ کسی جانور سے پوچھ لیتے ہیں۔" سامنے ایک بیل نظر آیا۔ شیر اس آدمی کو لے کر بیل کے پاس گیا۔ بیل نے سب کچھ سن کر اس آدمی سے کہا "تم غلطی پر ہو۔ شیر ٹھیک کہتا ہے۔ مالک مجھے سے دن بھر ہل چلواتا ہے اور شام کے وقت تھوڑی سی گھاس کھانے کو دیتا ہے۔" شیر نے آدمی سے کہا "اب تو تمہیں یقین ہو گیا بس اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" شیر ابھی آدمی کو کھانے ہی والا تھا کہ قریب سے ایک لومڑی گزری۔ آدمی نے شیر سے کہا کہ صرف آخری بار لومڑی سے پوچھ لو تو شیر نے لومڑی سے کہا کہ میں پنجرے میں بند تھا اور اس نے مجھے باہر نکالا اور اب میں اسے کھانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو لومڑی چالاکی سے بولی "میں نہیں مانتی کہ اتنا بڑا شیر چھوٹے سے پنجرے میں بند ہو جائے" شیر نے کہا کہ میں ابھی پنجرے میں بند ہو کر دکھاتا ہوں یہ کہہ کہ شیر پنجرے میں بند ہو گیا۔ جیسے ہی شیر پنجرے کے اندر گیا۔ لومڑی نے جھٹ سے پنجرے کی کنڈی لگا دی۔ اب شیر قید ہو چکا تھا۔ لومڑی نے آدمی سے کہا۔ "ظالم احسان فراموش ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نیکی نہیں کرنا چاہئے۔"

ایک خواب

عدیل شوکت، دوحہ قطر۔

عالیہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ جو دوسری کلاس میں پڑھتی تھی، لیکن اتنی چھوٹی ہونے کے باوجود بہت ذہین تھی۔ سب اس سے بہت پیار کرتے۔ وہ بھی اپنے والدین کا کہنا مانتی۔ اس کے امی ابو اس سے بہت خوش تھے۔

اس کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جہاں وہ کھیلتی تھی اور پڑھتی تھی۔ رات کو وہ وہیں سوتی تھی۔ جہاں اس کا بیڈ تھا وہاں سے ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ عالیہ رات کو اس کھڑکی میں سے نیلے آسمان کی طرف دیکھتی جہاں چمکتے ہوئے ستارے اسے بہت بھلے لگتے۔ ایک دن جب وہ رات کو سونے لگی تو وہ مسلسل آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے آسمان پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی سو گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب و غریب ہیلی کاپٹران کے گھر کے صحن میں آ کھڑا ہوا۔ اس کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اس ہیلی کاپٹر سے باہر نکلا۔ اس نے اشارے سے عالیہ کو پاس بلایا۔ عالیہ اس کے پاس چلی گئی اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئی۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر فضا میں اڑنے لگا۔ عالیہ ہیلی کاپٹر کے ارد گرد ستارے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے عالیہ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور وہ باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ چاند پر کھڑی ہے۔ وہاں اسے بہت ساری پریاں ملیں۔ وہ سب عالیہ کے ساتھ مل کر کھیلنے لگیں۔ انہوں نے تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد عالیہ کو چاند کی سیر کرائی اور انہوں نے اس کو بڑھیا اور اس کا چرخہ بھی دکھایا۔ عالیہ بہت خوش تھی۔ وہاں بہت سے پھول تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو عالیہ کو بہت بھا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے دوبارہ عالیہ کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کو کہا۔ عالیہ کا وہاں سے جانے کو دل نہ چاہا لیکن اسے اپنے امی ابو کے پاس جانا تھا۔ چنانچہ وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئی۔ وہ آدمی بھی ہیلی کاپٹر میں

بیٹھا۔ اور پھر ہیلی کاپٹر کو زمین کی طرف لے گیا اور صحن میں عالیہ کو اتار دیا۔ ایک دم عالیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو اپنا خواب یاد آیا۔ اس نے جلدی سے صحن کی طرف دیکھا، لیکن اسے کوئی ہیلی کاپٹر نظر نہ آیا۔ پھر اس نے نیلے نیلے آسمان کی طرف دیکھا جہاں بہت سے ستارے چمک رہے تھے۔ یہ دیکھ کر عالیہ کے ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

نصیحت

سیّدہ عنبرین نوشاد

دانش تھا بچّے کا نام — لڑنا بھڑنا اس کا کام
امی کی نہ مانے بات — کھیلے کودے دن اور رات
وقفے میں گھر آجائے — مس کی ڈانٹ سدا کھائے
کاپی پنسل بیچ آئے — آلو چھولے وہ کھائے
فیل ہوا اور پچھتایا — دانش کا سر چکرایا

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

ساتھی بچپن کے

سید رضوان راحت، ۱۶ سال، گیارہویں
بیالوجی، آرمی، گورنمنٹ ٹی آئی کالج
معرفت سید راحت حسین ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول خانپور

کاشف جہاں، ۱۰ سال، پنجم
ریاضی، ویسٹریج اکیڈمی
۴۵۷، ریلوے اسپتال ویسٹریج II راولپنڈی

پہلاج رائے، ۱۳ سال، ہشتم
انگلش، ڈاکٹر، گورنمنٹ ہائی اسکول
سپر انصاف کلاتھ ہاؤس، خانپور

محمد جاوید اقبال رضا، ۱۶ سال، دہم
فزکس، فوجی، گورنمنٹ ہائی اسکول
رحمان ٹاؤن ایل ۱۵/۱۵ تحصیل میاں چنوں ضلع خانیوال

جمشید عالم، ۱۳ سال، ہفتم
ریاضی، ڈاکٹر، گورنمنٹ ہائی اسکول
ڈی اینڈ ڈی کالونی ٹیکسلا

محمد قاسم سجاد گورائیہ، ۱۴ سال، نہم
ریاضی، ایم بی اے، گورنمنٹ علی محمد اسلامیہ اسکول
دفتر نونہال لیگ، اسٹریٹ ۵، بازار غلام محمد ٹھیکیدار گوجرانوالہ

سید ارشاد علی، ۱۴ سال، ہشتم
ریاضی، انجینئر، گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول
معرفت حکیم ریاست علی اعظم دواخانہ ہیرآباد میرپور خاص

ملک شاہد اقبال، ۱۴ سال، نہم
انگلش، اداکار، گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۸۱ شرقی پی/او ۲۵۵ جھنگ صدر

شہپر محبوب، ۱۳ سال، نہم
سائنس، انجینئر بننا، ایف جی ماڈل اسکول
مکان نمبر ۵۸۳، ۱۰/۹ جی، اسلام آباد

سید احسن علی، ۱۲ سال، ہفتم
سائنس، انجینئر، نیشنل ہائی اسکول
جی ۱۹۶ یو بی آئی ٹاؤنس بلاک ۴، گلشن اقبال کراچی

نسیم ساغر، ۱۲ سال، ہفتم
انگلش، ڈاکٹر، گورنمنٹ ہائی اسکول
پی او بکس ۱۲ تربت

پيارا دوستو!

السلام عليڪم،

اميد تہ اوهان سڀ خيريت سان هوندا.

۽ سياري جي موسم مان ڀرپور فائدو وٺندا هوندا. سياري جي موسم هڪ لحاظ کان خدا جي رحمت بہ آهي، تہ وري ڪن لاءِ زحمت بہ- پر انهيءَ موسم ۾ خدا تعاليٰ اسان لاءِ ڪيترا فصل ۽ ميوا پيدا ڪندو آهي، صرف انهيءَ لاءِ تہ اسان خدا جي وڏائي جو اقرار ڪريون ۽ سندس تعريف ڪريون. سياري جي سرد راتين ۾ اڪثر ليکڪن کان تمام سهڻيون ۽ اعليٰ تخليقون وجود ۾ اچي ويندي يون آهن. جن ۾ سياري جي شدت جو ڀرپور احساس هوندو آهي، توهان ٻڌايو؟ توهان بہ ڪا اهڙي تخليق پيدا ڪئي آهي يا اڃان وڏيڪ ٿڌ جي انتظار ۾ آهيو. هونءَ اها ڳالهہ پنهنجي جاءِ تي بالڪل سچ آهي تہ جيئن ٿڌ تيئن وڌ!

مان ڀهريون بہ اوهان دوستن کي عرض ڪيو آهي تہ ڪهاڻيون اسان وٽ تمام غير معياري اچن ٿيون ۽ توهان وري پڙهڻ بہ وڌ ۾ وڌ ڪهاڻيون ٿا چاهيون سو ڪم ڪيئن هلي، انهيءَ لاءِ هڪڙو ئي طريقو آهي تہ توهان سٺيون ڪهاڻيون لکڻ جي ڪوشش ڪريو ۽ ٻين دوستن کي بہ ان جي دعوت ڏيو.

ايندڙ شماري کان اسان ٻارڙن جو تعارفي سلسلو شروع ڪري رهيا آهيون. جنهن جو عنوان "سٺا ٻارڙا سنگت" هوندو، اوهان سڀني دوستن کي گذارش آهي تہ پنهنجو مڪمل تعارف اسان ڏي موڪلي ڏيو تہ جيئن توهان جو تعارف ٻين دوستن سان بہ ڪرائي سگهجي.

چڱو هاڻي خدا حافظ

سدائين گڏ

آغا در محمد

انچارج سنڌي سيڪشن

لقمان حڪيم

سجاد حسين مغل -روهڙي

دوستو! لقمان حڪيم نبض ڏسي دوا ڏيڻ وارو حڪيم ته نه هو بلڪ هي تمام عقل ۽ شعور جو مالڪ هو. حڪيم لقمان حضرت ايوب عليه السلام جو ڀاڻيجو هو، سندس رهائش گاهه شهر نوبه ۾ هئي. خانداني اعتبار سان ڀاڻ هڪ حبشي غلام هو ۽ ان سان گڏ وڏا اعليٰ اخلاق جو مالڪ پڻ هو. هن پنهنجي زندگيءَ جا ڪجهه اصول ٺاهيا هئا. جنهنجي تحت هو زندگي بصر ڪندو هو، اهي اصول الله تعاليٰ کي پسند آيا. ۽ کيس پنهنجي خاص رحمت سان نوازڻ چاهيائينس ته پهريائين حضرت جبرائيل عليه السلام کي موڪلي سندس مرضي معلوم ڪيائين.

حضرت جبرائيل عليه السلام لقمان ڏانهن آيا ۽ پڇيائونس " حڪمت پسند ڪندا يا نبوت"؟

سوچي وراڻيائون: " حڪمت"

جڏهن ماڻهن لقمان کان پڇيو ته توهان نبوت جي مقابلي ۾ حڪمت جو پسند ڪئي؟ وراڻيائين، ڀائرو! نبوت جي ذميواري سنڀالڻ هڪ عام انسان جي وس جي ڳالهه نه آهي، اگر الله تعاليٰ پنهنجي مرضيءَ سان

مونکي نبوت عطا ڪري ها ته ان جي حفاظت به پاڻ ڪري ها، اگر مان نبوت پسند ڪيان ها ته ان جي ذميداري به مون تي عائد ٿئي ها. ان جي مقابلي ۾ حڪمت اهڙي شيءِ آهي جنهن جي مدد سان انسان پاڻ به صحيح راهه تي هلي سگهي ٿو ۽ ٻين هجي رهنمائي به ڪري سگهي ٿو. ان لاءِ مان حڪمت پسند ڪئي.

هڪڙي ٻيري تمام وڏو مجموعو لڳل هو، لقمان ماڻهن کي حڪمت ۽ دانائي جون ڳالهيون ٻڌائي رهيو هو، سندس مالڪ به اتي پهتو ۽ حيران ٿي ويو ته لقمان ماڻهن کي خطاب ڪري رهيو آهي ۽ ماڻهو به نهايت خاموشيءَ سان ڪيس ٻڌي رهيا اٿس.

سندس مالڪ لقمان کي گهرايو ۽ پڇيائينس ته " تون ايترو معزز ڪيئن ٿي ويو آهين. لقمان پنهنجي مالڪ کي سچي حقيقت کان آگاه ڪيو. مالڪ پڇيس ته اهي ڪهڙا اصول آهن.

وراڻيائين:

1- مان ڪڏهن به ڪوڙ نه ڳالهائيندو آهيان.

2- مان ڪڏهن به فضول خرچي نه ڪندو آهيان.

3- مان ڪڏهن به امانت ۾ خيانت نه ڪندو آهيان.

4-هڪ جو راز ڪڏهن به ٻئي کي نه ٻڌائيندو آهيان.

5- الله تعاليٰ جي مخلوق سان پيار ڪندو آهيان.

لقمان سادگيءَ سان پنهنجي زندگيءَ جا سنهري اصول پنهنجي مالڪ کي ٻڌايا. سندس مالڪ لقمان حڪيم جي ڳالهين مان ڏاڍو متاثر ٿيو.

ايائو چوڪرو

رمني جي لوڪ ڪهاڻي

بلورسهيل

گهڻن ڏينهن جي ڳالهه آهي تہ هڪ ننڍي جهنگ ۾ هڪ ننڍڙي جهوپڙي ۾ هڪ پوڙهي عورت رهندي هئي پوڙهي جو هڪ ئي پٽ هو، جنهن جو نالو منو هو، ٻئي ماءُ پٽ ڏاڍا غريب هئا.

هڪ ڏينهن پنهنجي پٽ منوءَ کي چوڻ لڳي تہ پٽ! ائين گذارو ڪرڻ مشڪل آهي، تون جوان ٿي ويو آهين وڃ ڪو ڪم ڪار ڪر ۽ ڪجهہ ڪمائي اچ منو چيو : تہ امان هاڻي مان جوان ٿي ويو آهيان ۽ ڪمائي ايندس. منو اٿيو ۽ هلندي هلندي هڪ ڳوٺ ۾ اچي پهتو، اتي هڪ زميندار وٽ ڪجهہ ڪم پئي ٿيو، منو اتي ڪم ڪرڻ شروع ڪيو جڏهن شام جو ڪم پورو ٿيو تہ زميندار کيس مزدوريءَ طور هڪ چاندي جو رپيو ڏنو.

منو اهو رپيو پنهنجو بوٽ ۾ رکي ڇڏيو، ۽ گهر ڏانهن هليو، پر رپيو رستي ۾ ئي ڪٿي ڪري پيس. منو جي ماءُ کي جڏهن اها خبر پئي تہ چوڻ لڳي:

"اڙي ايائا چوڪرا، روپئي کي کيسي ۾ رکين ها نہ!"

" اما! چڱو، هاڻي ائين ئي ڪندس." منوءَ چيو ٻئي ڏينهن هو وري ڳوٺ ڏانهن هليو ويو ۽ هڪ ڀاڄيئي وٽ ڪم ڪرڻ لڳو، ڀاڄئي وٽ گهٽيون ئي ڏڪيون ۽ مينهون هيون. شام جو ڪم ختم ٿيو تہ ڀاڄئي

مزدوري طور هڪ چونٽري ڪير جي منوءَ کي ڏني. منوءَ کي پنهنجي ماءُ جو چوڻ ياد هو سو هن سمورو ڪير پنهنجي ڪيسي ۾ اوتي ڇڏيو ۽ روانو ٿي ويو گهر پهچڻ تائين سڄو ڪير وهي ويو.

تنهن تي هن جي ماءُ ڪيس چوڻ لڳي ته "اياڻا! چونٽريءَ کي ته مٿي، تي رکي کڻي اچين ها." "چڱو امان هاڻي ائين ئي ڪندس." منو ٿورو شڪي ٿيندي جواب ڏنو.

ٻئي ڏينهن منو هڪ ٻئي هاري وٽ ڪم ڪيو. جنهن وٽ تمام گهٽيون ڪڪڙيون هيون. شام جو هاري منو کي مزدوري ۾ هڪ ڊزن بيضا ڏنا. منو سڀ بيضا مٿي تي رکي، گهر ڏانهن هلڻ لڳو. گهر پهچڻ تائين سڀ بيضا هڪ هڪ ٿي ڪري پچي پيا.

" بيوقوف چوڪرا، بيضن کي هٿن ۾ کڻي اچين ها."

هن جي ماءُ چيو.

" چڱو امان هاڻي ائين ئي ڪندس."

ٻئي ڏينهن منو وري ڪم لاءِ نڪتو ۽ شام جو هڪ ٿلهي متاري ٻلي مزدوري ۾ مليس. منو ٻليءَ کي هٿن ۾ جهلي، گهر ڏانهن روانو ٿيو، پر ٻلي هن کي اهڙا ته رانيوڙا هنيا جو ويچاري کي ان مان هٿ ڪيڻا پيا. ۽ اها ڳالهه وري اچي ماءُ کي ٻڌايائين. ماءُ چيس: " بيوقوف نينگر ٻليءَ کي ڳچي ۾ رسي ٻڌي آڻين ها."

"چڱو اما هاڻي ائين ئي ڪندس."

ٻئي ڏينهن منو ڪنهن ڪاسائي وٽ وڃي نوڪر ٿيو، ۽ شام جو ڪم ختم ٿيو ته ڪاسائي مزدوري ۾ ٻڪريءَ جي ران ڏنس. هن ران کي رسيءَ ۾ ٻڌو ۽ گهليندو اٿي هليو! گهر پهچڻ تائين گوشت ته ڪتا ڪائي ويا، باقي هڏا وڃي وٽس بچيا، " اياڻا نينگر! ران کي ڪنڌ تي رکي اچين ها."

"امان هاڻي ائين ئي ڪندس."

ٻئي ڏينهن منو هڪ ٻڪرار وٽ مزدوري ڪئي ۽ شام جو هڪ ٻڪري

مزدوري ۾ ملپس، مٺوءَ کي ماءُ واريءَ ڳالهه ياد آئي ۽ ٻڪري کي ڪٺي ڪلهي تي رکيائين ۽ گهر ڏانهن روانو ٿيو رستي تي هڪ وڏي ماڻهو جو گهر هو. هن جي هڪ ئي ڌيءَ هئي جيڪا گهٽي سهٽي هئي پر ڪڏهن ٻه ڪلندي ڪونه هئي. امير جو چوڻ هو ته جيڪو ٻه هن کي کلائيندو تنهن سان هن جي شادي ڪرائيندس.

اها ڇوڪري پنهنجي گهر جي دريءَ مان هيٺ ڏسي رهي هئي ۽ مٺو کي جو ڪنڌ تي ٻڪري کڻي ايندو ڏٺائين سو ايتري ته کلي جنهن جي حد نه آهي.

ڇوڪريءَ جو پيءُ ڌيءَ کي کلندو ڏسي ڏاڍو خوش ٿيو. هن مٺو کي گهر ۾ گهرايو انهيءَ ڇوڪريءَ ۽ مٺو جي شادي ڪرائي وئي ۽ ڇوڪريءَ جي پيءُ مٺو کي تمام گهڻو پئسو به ڏنو. مٺو هڪ وڏو گهر خريد ڪيو ۽ پوءِ مٺو هن جي ماءُ ۽ سندس زال گهر ۾ ڏاڍو خوش گذارڻ لڳا.

سچي ڳالهه

افلاطون سچائيءَ جي فضيلت بيان ڪري رهيو هو. چيائين. سچائي ۽ سچ جي عظمت جو انڪاري ڪوبه نه آهي پر هڪ اهڙي به سچي ڳالهه آهي جنهن کان انسان کي پاسو ڪرڻ گهرجي.

هڪ شاگرد سوال ڪيو :- سچي ڳالهه کان پرهيز جو مطلب؟

وراڻيائين- اها سچي ڳالهه ته آهي پر لائق پرهيز ۽ اها آهي پنهنجي تعريف ڪرڻ. توهان منجهه اهي سڀئي خوبيون موجود هجن نه هجن پر انهن جو اظهار نه ڪيو ته بهتر آهي.

ذوهيب حسين مغل - روهڙي

هرڻي ۽ سردار

محمد صديق "مسافر" مثنوي

ٻڌو هيءَ ڳالهه هڪ هرڻيءَ جي ٻارو،
ڪريان هت رحم جو ٿو ذڪر سارو.

تہ غزني شهر جو هڪڙو سردار،
ويو جهنگل ڏي ٿي گهوڙي تي هسوار.

گهڻو ان جهنگ ۾ گهوڙو هلايو،
مگر هٿ ڪو شڪار ان کي نہ آيو.

ڏٺو اُن نيٺ هڪ هرڻيءَ جو ٻچڙو،
پٺيان ان جي ڇڏيائين گهوڙو تڪڙو.

ٻچو ڊوڙي ڊڪي آخر ٿڪي پيو،
ڪٺي سردار سو گهوڙي مٿي ڪيو

جڏهن ٻچڙو ڪٺي موٽيو ٿي سردار،
تڏهن هرڻيءَ بہ ڊوڙي آئي هيڪار.

ڏني هرڻيءَ مرڻ ڪان ڪين سائي،
ڪندي دانهون پٺيان گهوڙي جي آئي.

ڏسي هرڻي تنهن کي کهل پيئي،
کني لاهي ڇڏيائين ٻچڙو اتيئي.

وٺي ٻچڙي کي هرڻي جهنگ ويئي،
ہتو سردار گهوڙو گهر ۾ نيئي.

جڏهن ٿي رات آئي ننڊ سردار،
تڏهن سپني ۾ ٻيس آواز هن پار.

"تہ توکي ٻاجهہ هن هرڻيءَ تي آئي،
انهيءَ عيوض ۾ ملندءِ بادشاهي.

ڏٺي ان تي وري اهڙو ڪرم ڪيو،
جو اهو سردار جلد ئي بادشاه ٿيو.

موڪليندڙ-عبدالغفار احمد سومرو-اوباڙو-

گلن ڦلن جي ٽوڪري

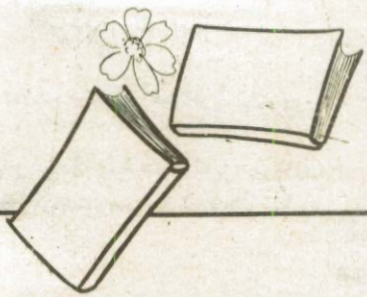

انيلا رضوي روهڙي

1- نہ گهٽي خاموشي سٺي آهي نہ گهڻو ڳالهائڻ سٺو آهي.

2- پنهنجو پاڻ کي پرکڻ بغير زندگي گذارڻ هڪ بي معنيٰ ڳالهہ آهي.

3- ڪوڙ تمام براين جي پاڙ ۽ سچ تمام براين جو علاج آهي.

4- عزت جو دشمن سوال هوندو آهي ان ڪري سوال دوست سان نہ ڪريو اگر اهو صحيح معنيٰ ۾ دوست آهي تہ ان کي پاڻ ئي احساس ٿيندو.

5- روزي انسان کي ان شدت سان ڳولهيندي آهي. جيترو ان کي موت ڳولهيندي آهي.

6- دنيا مومن لاءِ قيد خانو آهي ۽ ڪافر جي جنت آهي.

7- بنا ڪوشش جي ڪاميابي حاصل ڪرڻ ائين ئي آهي جيئن بنا پرن جي اڏامڻ جي ڪوشش ڪرڻ.

8- علم دل کي اهڙيءَ طرح زنده ڪري ٿو جيئن خشڪ زمين کي برسات.

9- تلوار جو زخم جسم تي ٿيندو آهي ۽ خراب گفتگو جو روح تي.

10- اسان جون غلطيون اسان کي اهو سبق سيکارين ٿيون جيڪي ڪنهن مڪتب ۾ بہ نہ ٿيون سيکاريون وڃن.

نيڪيءَ جو اجر

قره العين رضوي روهڙي

امر پنهنجي گهر جي اڱڻ ۾ ويٺي پڙهيو پئي ته اوچتو هڪ ٺڪاءُ ٿيو ۽ هڪ ڳيرو امر جي پير ۾ اچي ڪريو. جڏهن امر ڳيري کي کڻڻ جي ڪوشش ڪئي ته هو پر هڻڻ لڳو پر جڏهن امر ان مٿان شفقت ڀريو هٿ ڦيريو ته هو امر ڏانهن ڏسڻ لڳو. شايد ڳيرو اهو سوچي رهيو هو ته ڪهڙا ماڻهو ماري ٻڌجي مارڻ چاهين ٿا ۽ ٻيا وري اهڙا جيو آهن جيڪي جيارڻ جا جتن ڪري رهيا آهن. پوءِ امر ڳيري اڳيان پاڻيءَ جي ڪٽوري ۽ چانورن چڪي ونڙيءَ ۾ وجهي رکي پاڻ هڪ پاسي ٿي ويهي رهيو. ٿوريءَ دير ڪانپوءِ امر ملم ۽ پٽي کڻي ڪري هن جي زخمي ٽنگ جي ملم پٽي ڪئي ۽ هن لاءِ هڪ سرن جي کڏي ٺاهيائين جنهن ۾ هن کي وجي ويهاريائين. هي هن جي سار سنڀال ڪندو رهيو اهڙيءَ طرح ڏينهن گذرندا ويا ۽ ڳيرو ٻه چاڪ و چوبند ٿي ويو ۽ پوءِ امر ڳيري کي کڻي گهر جي ڇت تي آيو ۽ کليل فضا ۾ ڇڏي ڏنائينس ۽ هي جهٽ پل ۾ اکين کان دور ٿي ويو امر لهي هيٺ آئي. ڪجهه ڏينهن ڪانپوءِ جڏهن امر ساڳئي ريت اڱڻ ۾ پڙهي رهي هئي ته ڪنهن پکيءَ جي ڦڙ ڦڙهائڻ جي آواز پير ۾ ٻڌائين هن ڏٺو اهو ساڳوئي ڳيرو هو جنهن جي چهنب ۾ هڪ سوني زنجيري هئي جا پڻ ڳيري امر آڏو اچي رکي امر اها ڏسي ڳيري طرف ڏٺو ڄڻ ڳيرو پنهنجي زبان ۾ چئي رهيو هجي ته هي تنهنجو اجر آهي تون هر پکي پکڻ سان ۽ خدا جي ساري مخلوق سان ائين ئي محبت ڪندي رهجانءِ ائين چئي هو کليل هوا ۾ اڏامي ويو.

كهاڻي

ٽي ساڙيل

سنڌيڪار- سيد محمد شاھ کوکرائي

ڳالهہ ٽا ڪن تہ هڪڙا ٽي ماڻهو گڏ سفر ڪري رهيا هئا تہ رستي ۾ کين اشرفين جي هڪ ديڳ هٿ لڳي، پهريائين تہ هنن سوچيو تہ اُهي اشرفيون ٽي حصا ڪري ورهائي کڻون ۽ باقي زندگي آرام سان گذاريون، پر جيئن تہ هو ٽيئي ساڙيل هئا. انڪري ڪنهن سوچيو تہ جيڪڏهن سندن ٻن ساٿين کي حصو مليو تہ هن جي پنهنجي حصي ۾ تمام ٿوريون اشرفيون اينديون. اُهو سوچي ٽيئي هڪ ٻئي جا دشمن ٿي پيا. ٽنهي مان هر هڪ اهو سوچڻ لڳو تہ ڪا اهڙي ترڪيب ڪجي جو سڀ اشرفيون ڪيس ملي وڃن ۽ باقي ٻن لاءِ ڪجهہ بہ نہ بچي. نتيجو اهو ٿيو جو اشرفيون ورهائجي نہ سگهيون ۽ ٽيئي ماڻهو پنهنجي

هوڏ تي قائم رهيا.

اتفاق سان ان ملڪ جو بادشاهه پنهنجن وزيرن سميت اتان اچي لنگهيو. هن ٽنهي ماڻهن کي پاڻ ۾ وڙهندي ڏسي کين پاڻ وٽ گهرايو ۽ وڙهڻ جو سبب پڇيو. هر هڪ بادشاهه کي ٻڌايو ته هو هڪٻئي سان حسد ڪن ٿا ۽ هر هڪ چاهي ٿو ته سڀ اشرفيون کيس ملن. انهن جو بيان ٻڌي بادشاهه چيو ” اها ڳالهه صحيح آهي توهان ٽيئي ساڙيل آهيو“. پر اها ڪيئن پڪ ڪجي ته توهان ٽنهي مان سڀ کان وڌيڪ حسد ڪنهن ۾ آهي توهان مان هر هڪ پنهنجو پنهنجو بيان ٻڌائي، پوءِ جنهن ۾ به ساڙ وڌيڪ هوندو تنهن کي اهي اشرفيون ڏنيون وينديون.

بادشاهه جو اهو فرمان ٻڌي هڪ چيو! ” حسد سبب مان ڪنهن تي به احسان نه ڪندو آهيان سوچيان ٿو ته جنهن تي احسان ڪندس اهو خوش ٿيندو ۽ ٻئي جي خوشي مونکي بلڪل نه وڻندي آهي.“

ٻئي چيو! ” مون ۾ پهرئين کان به وڌيڪ ساڙ آهي. مان ٻئي تي ته احسان ڪونه ڪريان پر اٽلندو ڪنهن ٻئي جو مون تي احسان ڪرڻ به پسند نه اٿم.“

ٽئين چيو: ” هي ٻيئي ماڻهو ساڙ ۾ مونکا تمام گهٽو پوئتي آهن. مون ۾ ايترو ته ساڙ آهي جو مان ڪڏهن به نه چاهيندو آهيان ته ڪو ٻيو مونسان ڀلائي ڪري. مان ته پنهنجو پاڻ سان به ساڙ ڪندو آهيان.“

بادشاهه کي ٽنهي جون ڳالهيون ٻڌي ڏاڍي ڪاوڙ آئي. انهن ٽنهي حسد ڪندڙن کي مخاطب ٿيندي چيائين: ” جيڪو ماڻهو ٻئي جو ڀلو نٿو گهري تنهن سان وري ڪهڙي ڀلائي ڪجي! توهان جي سزا اها آهي ته انهن اشرفين مان توهانکي هڪ به اشرفي نه ڏني وڃي.“

ان کانپوءِ اها اشرفين جي ديگ شاهي خزاني ۾ جمع ڪرائي ڇڏيائين. ٽيئي ماڻهو مايوس ٿي هٿين خالي پنهنجن گهرن ڏانهن روانا ٿي ويا.

ذهني آزمائش

يلا ٻڌايو تہ سهي!

هيٺين جملن ۾ ڪهڙن شهرن جا نالا آهن.

۱- آئون تو ٻڌايانوَ تہ پنو، عاقل ڪنيو آهي.

۲- سبق ڏيان سان پڙهہ احمد پورو ڪتاب پڙهي ويندو آهي.

۳- ڪاش احمد ڪي سک رسي ها تہ ڏکيو نہ ٿئي ها.

۴- شهزادا دولت ڪٿي آيا.

۵- سڀ دوست سج لهڻ جي ڪري شڪارپورو نہ ڪري سگهيا.

(ذيشان احمد شيخ)

جابر بن حيان

جابر بن حيان ڪوفي جي هڪ مشهور عطر فروش وٽ ۷۲۱ع ۾ پيدا ٿيو، هن جي شهرت علم ڪيميا جي ڪري پوري دنيا ۾ ٿي، ۽ ڪيس علم ڪيميا جو ڏاڏو آدم بہ ڪري چوندا آهن. ڪيس دنيا جي پهرين ڪيميادان هجڻ جو بہ اعزاز حاصل آهي. جابر بن حيان کي يوناني زبان تي عبور حاصل هو. انهي ڪري هن يوناني علم ڪي گهٽي مقدار ۾ عربيءَ ۾ منتقل ڪيو. جابر بن حيان پنهنجي ڪيميا جي ڪتابن ۾ لوهہ ٺاهڻ چمڙو رنگڻ، لوهہ کي زنگ کان بچائڻ لاءِ ان تي وارنش ڪرڻ، وارن کي ڪارو ڪرڻ لاءِ خضاب تيار ڪرڻ ۽ اهڙي قسم سان ٻيا بہ ڪيترائي طريقا بيان ڪيا آهن. هن عظيم مسلمان سائنسدان جي وفات ۸۱۷ع ۾ ٿي.

موڪليندڙ/ شهنيلا گل ڪراچي

ٻجهارتن جي پاڙ

1- ڪٽڪ ڪڏي ٻهه ڪي ٻاهه ڏي.

2- ڪوسو پاڻي ڪڪ نه ساڙي .

3- گڏه پنهنجي ساوٽي هينگن ۾ وڃائي .

4- گڏهه جو ڇا وس جو ٻيڙيءَ ۾ نه چڙهندو

5- ڄاڻي وڃونءَ جون مُنڍ ٻه نه، هٿ وهجي نانگن ۾.

ٻجهارتن جي صحيح سمجهاڻي موڪليندڙ ساٿيءَ کي ٻيڪيءَ جي وسيلي انعام موڪليو ويندو.

انعامي سلسلي جو اعلان

*- اهي ساٿي جن جا سڀ جواب صحيح مليا.
1- نور حسين جتوئي هالا، 2- سيد واجد حسين شاه روهڙي، 3- شهينلا گل ڪراچي.
*- اهي ساٿي جن کان ہہ غلطيون ٿيون.
1- انيلا رضوي روهڙي، 2- نوشين گل ڪراچي.
گلشاز ابراهيم، حيدرآباد نادیہ میمڻ، حيدرآباد
*- اهي ساٿي جن کان ٽي غلطيون ٿيون.
1- سجاد حسين مغل روهڙي، 2- غلام جعفر جوڻيجو حضوري ٽنڊو آدم، 3- ذوهيب حسين مغل روهڙي، 4- عبدالشڪور سنيهڙو-ٽنڊو آدم، 5- عبدالاحد ميمڻ- شڪارپور، حيدر علي احمد. 6- مقبول احمد سنيهڙو- ڳوٺ قيصر سنيهڙو-منصوره، 7- عبدالحفيظ کيهر(منصوره، قره العين رضوي روهڙي
جنهن خوش نصيب ادڙيءَ جو پڪي وسيلي نالو نڪتو اها آهي
شهنيلا گل ڪراچي.
جنهن کي جلد ٽپال ذريعي انعام موڪليو ويندو.

ابن سينا

مشهور مفڪر، طبيب، رياضي دان، سائنسدان ٿي گذريو آهي، ارسطو جي فلسفي تي گهري نظر رکندو هو، ٩٩ ڪتابن جو مصنف هو. انهن ڪتابن جو دنيا جي وڏين وڏين زبانن ۾ ترجمو ٿيا. همدان ۾ وفات ڪيائين ۽ اتي ئي دفن ٿيو. سندس وفات (١٠٣٧ع) ۾ ٿي.

اوهان جي پرک

سائمہ وکيل

ف	ج	ا	ٿ	ج	ه	ن	ڊ	ڪ	ا
ن	ه	ٿ	و	ي	ڪ	ف	ا	ر	ڊ
ا	ا	ل	ي	ر	ي	ٿ	ي	م	ي
ڪ	ز	ي	ا	ل	م	ڊ	ڪ	ا	س
ب	ل	ڊ	ر		ي	ل	ٿ	ر	ن
ل	ٿ	م	ي	و	ر	ف	ن	ڪ	س
م	ي	ه	م	ب	ا	م	و	و	ل
ا	ڪ	ا	ي	ت	ء	ل	ڪ	ن	س
ٿ	ا	ر	ڪ	و	ا	و	ب	ي	ب
س	ر	گ	ن	ي	م	ٿ	س	ي	ا

هن چارٽ مان مختلف ايجادون ۽ سائنسدانن جا نالا
ڳولهي ڏيکاريو-

خط

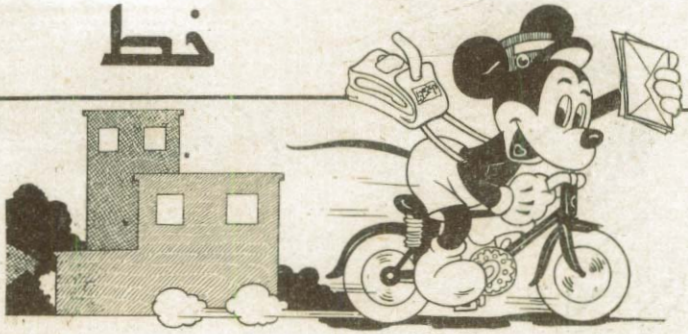

اسلام عليڪم

سائين خوش هجو. آنکهه مچولي سان منهنجي دوستي تمام پراڻي آهي پر الاءِ ڇو اوهان ايندي ئي منهنجو مواد ڇپڻ بند ڪري ڇڏيو. ڇو مهيني باقائدگي سان ڪهاڻيون، شعر موڪليندو رهندو آهيان پر الاءِ ڇو نٿا شايع ڪريو. اوهان کي ڪهڙي خبر ته ڪيڏي آس ۽ اميد رکي اوهان ڏي مواد موڪليندو آهيان.

سائين ائين نه ڪيو اسان جي همت افزائي ڪيو. ڌرڪي شهر مان ٻارڙن لاءِ هڪ رسالو ڇپرايون ٿا اوهان ڏانهن ضرور اماڻبو

عبدالغفار سومرو –اوٻارڙو

2- مان سنڌي سيڪشن لاءِ هڪ ڪهاڻي موڪليان ٿو. اميد آهي ته آنکهه مچوليءَ ۾ شايع ڪندا. مون کي لکڻ جو شوق ڏاڍو آهي. مان به ٻين وانگر مصنف ٿيڻ چاهيان ٿو. ان لاءِ اوهان جي مدد گهرجي.

نويد احمد لوهر- جيڪب آباد

3- جيئن ته اوهان کي خبر آهي ته مان سنڌي سيڪشن لاءِ ڪافي مواد موڪليندو رهندو آهيان. پر الائي ڇو منهنجو مواد شايع ڪونه ٿا ڪريو؟ " ايجادات نمبر لاءِ به گهڻو لکي موڪليو هيم پر اوهان اهو به شايع نه ڪيو؟.

محمد شاه ڪوڪرائي -ڳوٺ ڪوڪر

بچّوں کے لئے NIDO کے
رنگ برنگے تحفے

ہر 400 گرام پیک کے ساتھ
ایک رنگین پنسل سیٹ (چھوٹا)
اور ہر 1600 گرام پیک
کے ساتھ ایک خوبصورت
کلرنگ بک اور رنگین
پنسل سیٹ (بڑا) مفت
حاصل کریں۔

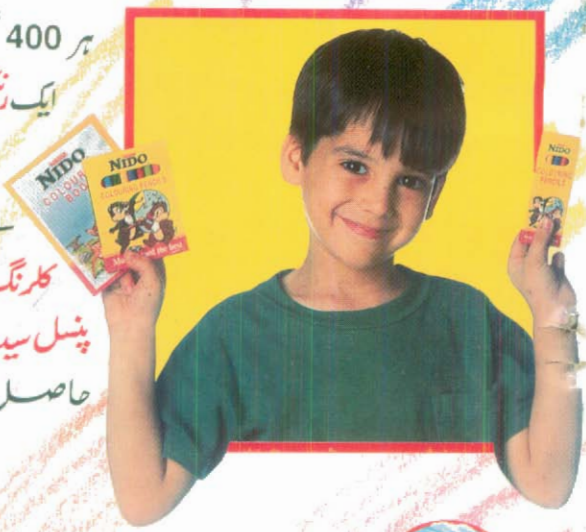

اپنے بچے میں چھپے مصور کی حوصلہ افزائی کیجئے اور مزید انعامات کے لئے
NIDO سوہنی دھرتی آرٹ کونٹیسٹ میں حصہ لیجئے۔
تفصیلات NIDO سوہنی دھرتی آرٹ کونٹیسٹ پیک پر پڑھیئے۔

Nestlé NIDO INSTANT ممتا کا تقاضہ ۔ بہترین انتخاب

REGD. No. M-266 FEBRUARY 1993
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI